إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اپریل ۲۰۱۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ الـبرہان لاہور

جلد ۱۷، شمارہ ۴ ۔ اپریل ۲۰۱۳ء/ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ

مشمولات

Oفکر و نظر

انتخابات ۲۰۱۳ء
نہ تیرے درد کا درمان، نہ میرے درد کا درماں — مدیر — ۲

Oتعلیم و تربیت

ایک اسلامی سکول کس طرح کا ہونا چاہیے؟ — ۴

کراچی میں ایک اہم تعلیمی کانفرنس — ڈاکٹر محمد امین — ۹
قبول مغربیت اور تقدیس بچہ پروگرام

Oحالات حاضرہ

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں عبرت کیوں نہیں پکڑتیں؟ — پروفیسر طارق بٹ — ۱۴

تعلیم کی بربادی پر شہباز شریف کو نااہل قرار دیا جائے — اشتیاق احمد — ۱۷

Oدینی مدارس کا نظام تعلیم

فضلاء کی خدمت میں چند گزارشات — مفتی محمد اصغر — ۲۲

Oتفہیم دین

توہین رسالت کی آڑ میں بربریت — ملی مجلس شرعی — ۳۰
ایک علمی مذاکرہ

Oتزکیۂ نفس

حب جاہ کے مریضوں کے لیے ایک انجکشن — ادارہ — ۳۷

Oاسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی

جدید سائنس کے ناقدانہ مطالعہ کی ضرورت — سید خالد جامعی — ۳۸

Oتبصرہ کتب

اتحاد بین المسالک میں ناکامی — پروفیسر عبد الخالق — ۵۲
علماء کرام کی خدمت میں ۱۲ سوال

Oتبصرہ کتب

سیکس سب کے لیے از پروفیسر ارشد جاوید — مدیر — ۵۴

فکر و نظر

انتخابات ۲۰۱۳ء

نہ تیرے درد کا درماں، نہ میرے درد کا درماں

ہم جیسے لوگوں کے لیے انتخابات ۲۰۱۳ء میں کوئی نوید نہیں ہے جو یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ قوموں کی ترقی اور عروج کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے وابستہ اور اس پر عمل پیرا ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ پاکستان چونکہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور ہم نے بحیثیت قوم پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا اعلان کیا تھا اور اس کا اللہ سے عہد کیا تھا لہذا پاکستان کا مستقبل اسلام اور اسلامی نظریۂ حیات سے وابستہ ہے۔

اور یہ کہ جو دینی سیاسی جماعتیں اس ملک میں اسلام کی علمبردار ہیں ان کی شکست صاف سامنے نظر آ رہی ہے۔ اور اس کے لیے علم غیب یا علم نجوم جاننے کی ضرورت نہیں بلکہ معمولی کامن سینس ہی کافی ہے کیونکہ:

☆ یہ دینی عناصر اسلام پر عمل کے کسی قومی اور اجتماعی پروگرام پر متحد اور متفق ہونے کو تیار نہیں ۔کیونکہ انہوں نے اپنی سیاسی جماعتیں اپنے فرقے اور مسلک کی بنیاد پر بنائی ہوئی ہیں بلکہ ہر مسلک کے اندر کئی کئی جماعتیں بنی ہوئی ہیں۔ جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں اپنے ذاتی مفادات مسلک سے اور مسلکی مفادات دین سے عزیز تر ہیں۔

☆ ان کا ذاتی اور جماعتی اخلاق و کردار اور کارکردگی ایسی نہیں کہ قوم ان پر اعتماد کرے لہذا ان سیاسی جماعتوں کے انتخابات جیتنے، حکومت بنانے یا ملکی سیاست میں کوئی فیصلہ کن یا اہم کردار ادا کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں اگر اسلام نہیں آتا تو کم از کم جمہوریت ہی آ جائے تا کہ یہ معاشرہ انسانوں کے رہنے کے قابل ہو سکے اور غربت و جہالت اور پسماندگی میں پسے ہوئے انسانوں کے لیے کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کہیں سے آئے تو اس کا بھی کوئی امکان ہمیں نظر نہیں آتا کیونکہ:

☆ امریکہ اور یورپ ہمارے ہاں نہ اسلام چاہتے ہیں نہ جمہوریت۔ ان کی بنیادی خواہش یہ ہے کہ یہاں حقیقی تبدیلی نہ آئے، نہ تعلیم عام ہو اور نہ خوشحالی آئے کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو لوگ امریکی و یورپی غلامی سے نکلنا چاہیں گے اور ظاہر ہے یہ انہیں گوارا نہیں۔ لہذا وہ اپنی قوت اور رسوخ اس مقصد سے استعمال کرتے ہیں کہ یہاں ایسی حکومت ہو جو ان کی فکر و تہذیب اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے، جو حالات کو جوں کا توں (Status quo) برقرار رکھے اور کسی بڑی تبدیلی کا سبب نہ بنے۔ اور اس وقت تک وہ اس میں کامیاب ہیں کیونکہ ہماری قوم میں، الا ماشاء اللہ، میر جعفروں کی کمی نہیں۔ وہ انہیں کبھی پرویز مشرف کی صورت میں مل جاتے ہیں، کبھی زرداری کی صورت میں اور آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔

اسی لیے ہم نے انتخابات سے پہلے بارہا کہا کہ دینی اور سیاسی جماعتوں کو نفاذ اسلام اور مغربی استعمار کی غلامی سے نکلنے کے پروگرام پر متفق ہو کر انتخابات میں حصہ لینا چاہیے لیکن ہماری نحیف آواز کسی پر اثر انداز نہ ہو سکی اور دینی و سیاسی جماعتوں میں یہ شعور بھی راہ نہ پا سکا کہ ان میں فکری انتشار پیدا کرنے والا اور نہیں متحد نہ ہونے دینے والا کون ہے؟ اگر ہماری دینی اور سیاسی قیادت میں اخلاص اور فراست کی کمی کا یہی حال رہا تو قوم کو تباہی سے کون بچا سکتا ہے؟

لہذا اس جمہوری کھیل تماشے سے جو اگلے چند ہفتوں میں ہمارے ملک میں ہونے والا ہے، ہم کسی خیر کی توقع نہیں کرتے بلکہ غالب امکان یہ ہے کہ اہل مغرب کو مشرف اور زرداری کے بعد جو ایک تازہ دم گھوڑے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی وہ اسے ان انتخابات کے نتیجے میں مل جائے اور وہ اپنے مفادات زیادہ بہتر طریقے سے حاصل کر سکیں اور پاکستانی عوام کے ہاتھ کچھ نہ آئے سوائے بڑھتی ہوئی غربت، جہالت، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، بدامنی، دہشت گردی، فحاشی، عریانی اور بے حمیتی کے۔

ان حالات میں پاکستانی معاشرے کو بے دینی سے بچانے اور دکھوں سے نجات دلانے کا راستہ کیا ہے؟ ہمارے ذہن میں اس کا نقشۂ کار آج بھی واضح ہے لیکن ہم اس کی تفصیل اگلے شمارے میں عرض کریں گے تاکہ قوم انتخابات کے تماشے سے فارغ ہو جائے اور معاشرے میں دین کا درد رکھنے والے اور سوچنے سمجھنے والے عناصر کسی متبادل پروگرام پر غور کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

ایک اسلامی سکول کس طرح کا ہونا چاہیے؟

بنیادی ایشو

نارمل حالات میں عصر حاضر کی ایک ریاست میں ایک سکول اور سکول قائم کرنے اور چلانے والی انتظامیہ کو اس قسم کے مباحث سے کہ سکول کا نصاب کیسا ہونا چاہیے اور اس کے مقاصد کیا ہونے چاہئیں ۔۔۔ سے واسطہ نہیں پڑتا کیونکہ ریاست عوام کے معتقدات اور نظریات کے مطابق ایک 'نظام تعلیم' وضع کر دیتی ہے اور تعلیم کے مقاصد، ترجیحات اور بنیادی تعلیمی ایشوز جیسے رسم الخط، قومی زبان، ذریعۂ تعلیم، نصاب، تربیت اساتذہ وطلبہ ۔۔۔ کے بارے میں بنیادی پالیسی طے کر کے اسے نافذ کر دیتی ہے اور اس پر عمل درآمد کراتی ہے لہذا کسی سکول کو انفرادی طور پر یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ نصاب کیا ہونا چاہیے اور سکول کا مشن ومقصد کیا ہونا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا۔ کیوں نہیں ہو رہا، اس کے کیا نتائج نکلے ہیں اور اس میں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے؟ جب تک ہم ان سوالوں کا جوابات نہ دیں، ہم موضوع زیر بحث سے انصاف کر سکتے ہیں اور نہ قارئین ہماری ان تجاویز کی افادیت اور معنویت کو سمجھ سکتے ہیں جو ہم اس سوال کے جواب میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آج کے پاکستان میں ایک اسلامی سکول کس طرح کا ہونا چاہیے؟

پاکستان کے تعلیمی حالات، پس منظر و پیش منظر

☆ افرادِ معاشرہ کی ایسی اصلاح کا، جس سے وہ اپنی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق بسر کر سکیں، بنیادی ذریعہ تعلیم و تربیت ہے چنانچہ قرآن حکیم میں چار دفعہ آیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے کار نبوت انجام دینے کا جو منہج عطا فرمایا تھا وہ دو اصولوں پر مبنی تھا۔ ایک تعلیم کتاب وحکمت (یعنی قرآن حکیم کی تعلیم اور ان دیگر امور کی تعلیم جو قرآن کے مطابق زندگی گزارے کے لیے ضروری ہیں اور دوسرے تزکیہ (یعنی انسانی شخصیت عملاً تعلیم قرآن وحکمت کے مطابق ڈھل جائے اور اس کے لیے قرآن کے مطابق زندگی گزارنا ممکن اور آسان ہو جائے)۔ اس سے صحیح نظام تعلیم و تربیت کی اہمیت بھی واضح ہو گئی کہ ایک مسلمان کی دنیا وآخرت میں کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔

☆ مسلم امہ کے زوال اور کمزوری کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس کا نظام تعلیم و تربیت غیر مؤثر ہو

گیا، معاشرہ اپنے نظریۂ حیات (اسلام) سے دور ہو گیا اور مذہبی و سیاسی قیادت اور اہل دانش اس صورت حال کی اصلاح میں ناکام ہو گئے۔

☆ اس کے نتیجے میں حریف یورپی و مغربی ممالک نے طاقت پکڑی اور مسلمانوں پر غالب آ گئے اس کے باوجود کہ ان کی فکر و تہذیب کفر پر مبنی تھی۔ مغربی ممالک نے نہ صرف مسلم ممالک کی دولت او مالی وسائل کو لوٹا بلکہ انہیں ہمیشہ غلام رکھنے کی پلاننگ کے تحت ان کے ریاستی و معاشرتی ڈھانچے کو توڑ کر اپنی فکر و تہذہب پر مبنی ادارے تشکیل دیے خصوصاً ان کے نظام تعلیم کو ختم کر کے اپنا نظام تعلیم وہاں نافذ کیا تا کہ مسلمان معاشرے میں غلام ذہن پیدا ہوتے رہیں جو مغربی ممالک کے مفادات اور ان کی فکر و تہذیب کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں اور نہ اسلامی اصولوں پر صحیح مسلم معاشرے و ریاست کے احیاء کے لیے کام کر سکیں۔

☆ جب دوسری جنگ عظیم میں آپس کی لڑائیوں میں کمزور ہو جانے کے بعد یورپی و مغربی ممالک کے لیے مسلم ممالک کو مکمل غلام رکھنا ممکن نہ رہا تو ان کے عیار استعماری ذہن نے امن کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر جارحیت کو چھوڑ کر پرامن طریقے سے مسلمان ممالک کو غلام اور زیر دست رکھنے کی حکمت عملی پر عمل شروع کر دیا جس کے تحت انہوں نے اپنی سیاسی، معاشی اور سائنسی بالا دستی اور اثر و نفوذ کو بروئے کار لاتے ہوئے مسلم ممالک میں ایسے حکمران لانے شروع کیے جو ان کی فکر، ان کی تہذیب اور ان کے مفادات کے لیے کام کریں۔ انہوں نے مسلم ممالک کی معاشی حالت کو نہ سدھرنے دینے کے لیے ان کے کرپٹ حکمرانوں اور بیوروکریسی کے ذریعے ان کے مالی و مادی وسائل ضائع کرائے، انہیں امداد اور قرضوں کے جال میں جکڑا اور مسلم عوام کو نان جویں کا محتاج کر دیا۔

☆ انہوں نے مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت و میڈیا کو اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہونے دیا بلکہ پوری کوشش کی کہ ان کا استعماری دور کا مسلط کردہ نظام تعلیم ہی جاری رہے اور اگر اشک شوئی کے لیے کچھ ظاہری تبدیلی کرنی بھی پڑے تو وہ برائے نام ہو اور اصل استعماری سپرٹ باقی رہے تا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں پر بھی مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ رہے اور ان کی قائم کردہ ذہنی غلامی کا تسلسل جاری رہے۔ ہماری بد قسمتی اور شامت اعمال کہ امریکی سربراہی میں مغرب ان کوششوں میں کامیاب رہا اور جہاں ان کی پوری کوششوں کے باوجود بعض مسلم ممالک نے سر اٹھایا تو انہوں نے امن کا لبادہ اتار کر اپنی جدید ترین اور ہولناک جنگی مشینری استعمال کر کے انہیں تہس نہس کر دیا۔ چنانچہ ہماری آنکھوں دیکھتے پچھلی دو دہائیوں میں عراق افغانستان اور لیبیا کو کچل دیا گیا اور پاکستان پر حملے، شام کا گھیراؤ اور ایران پر دباؤ جاری

ہے۔

☆ پاکستان کے نظام تعلیم میں امریکی و یورپی مداخلت نے جو صورت حال پیدا کی ہے اس کے چند اہم مظاہر درج ذیل ہیں:

- لارڈ میکالے کے نظام تعلیم اور اس کی سپرٹ کو جاری رکھنا جس کا ہدف یہ تھا کہ نئی نسلیں برائے نام مسلمان ہوں اور اصلاً مغربی فکر و تہذیب کی شائق اور دل دادہ رہیں اور مغرب کی فکری اور ذہنی غلامی کو قبول کریں۔

- ثنویت کو ختم نہ ہونے دینا او وحدت تعلیم کے تصور پر عمل نہ ہونے دینا یعنی جدید تعلیم کے اداروں میں مؤثر اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہونے دینا اور دینی مدارس کا الگ تعلیمی نظام جاری رکھنا جس میں عصری علوم کی تعلیم نہیں ہوتی۔ (تاکہ اسلام مسجد و مدرسے کے کونے تک محدود رہے اور ریاست اور معاشرے کا وسیع تر نظام ان لوگوں کو ہاتھ میں رہے جو سیکولر، بے دین اور مغرب پرست ہیں)۔

- انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا ہے جو بہت بڑا ذریعہ ہے قوم کو جاہل اور ناخواندہ رکھنے کا (کیونکہ انگریزی کے لازمی ہونے اور اس کی تدریس مؤثر نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ انگریزی کے پرچے میں فیل ہو جاتے ہیں اور تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے) اور انہیں تخلیقی صلاحیتوں سے محروم رکھنے کا (کیونکہ انگریزی کی عدم تفہیم کی بناء پر طلبہ رٹے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مضامین کو سمجھ نہیں سکتے اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں دب جاتی بلکہ کچلی جاتی ہیں)۔ نیز انگریزی کا غلبہ بنیاد اور ذریعہ ہے تعلیمی ماحول میں مغربی فکر و تہذیب کو بالا دست رکھنے کا (چنانچہ سکولوں کا یونیفارم دیکھ لیجیے، ان کی ہم نصابی سرگرمیاں دیکھ لیجیے، ان کا نصاب دیکھ لیجیے، اساتذہ کا لباس دیکھ لیجیے سبھی پر مغربی تہذیب کا غلبہ اور اس کی پیروی کا جذبہ نمایاں نظر آئے گا)۔

- مخلوط تعلیم (تاکہ مسلم نوجوانوں کے اخلاق تباہ ہوں اور ان کا خاندانی نظام ٹوٹ کر بکھر جائے) یہ پہلے صرف یونیورسٹیوں میں ہوتی تھی اب اسے سکولوں تک وسعت دے دی گئی ہے خصوصاً پنجاب میں اور وہ بھی میاں شہباز شریف اور اس مسلم لیگ کے دور حکومت میں جو اپنے آپ کو جناح اور اقبال کا نام لیوا کہلاتی ہے۔

- پاکستانی مصنفین کی کتابوں کو غیر تحقیقی اور غیر معیاری قرار دے کر رد کر دینا اور غیر مسلم و غیر ملکی مصنفین کی کتابوں کو اعلیٰ قرار دے کر رائج کرنا۔

- پاکستان کے نظام امتحانات کو ردی قرار دینا، سکول کی تعلیم میں میٹرک ایف اے کی بجائے برطانیہ کے او اور اے لیول امتحانات کو پاکستان میں رائج کرانا۔ یونیورسٹی سطح پر Split ڈگری پروگرام اور علمی تعاون کے نام پر مغربی یونیورسٹیوں کا نصاب پاکستانی یونیورسٹیوں میں پڑھانا۔

- ملک میں یکساں نظریاتی نظام تعلیم قائم نہ ہونے دینا چنانچہ تعلیم میں طبقہ واریت عام ہے، غریبوں کے سکول الگ ہیں اور امیروں کے الگ۔ انگریزی میڈیم سکول الگ ہیں اور اردو میڈیم الگ اور دونوں کا مخلوط ایک تیسرا برانڈ الگ۔ اور ہر ایک کا اپنا اپنا نصاب ہے اور اکثر کا نصاب نظریاتی جہت سے عاری ہے اور مغرب پرست پر مبنی ہے۔

- تعلیم کو free for all بنا دیا گیا ہے یعنی جو چاہے کرو کوئی پابندی نہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، جو چاہے نصاب رکھو، جس طرح کے چاہے اساتذہ رکھو، جس طرح کی چاہو ہم نصابی سرگرمیاں رکھو، مخلوط پکنک بھی صحیح ہے، میوزک اور ڈانس کی کلاسیں بھی ہو رہی ہیں، نوجوان مسلم لڑکیوں کے لیے سوئمنگ پول بھی ہیں -----

- تعلیم کو مرکزی حکومت کے دائرہ اثر سے نکال کر صوبوں کے حوالے کر دیا گیا ہے اور ہمارے ہاں صوبے سوئے اتفاق سے زبان، کلچر، نسل، علاقے اور معاشرتی و معاشی تفاوت کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف شناخت رکھتے ہیں اور امریکہ و بھارت کے زیر اثر وہاں علیحدگی کی تحریکیں پہلے سے جاری ہیں لہذا شعبہ تعلیم صوبوں کو دینا درحقیقت پاکستان کو توڑنے کا پُر امن منصوبہ ہے جس پر خاموشی سے عمل درآمد جاری ہے۔

- تعلیم کو عام نہ ہونے دینا۔ اس پر جی ڈی پی کا ۲ فیصد سے بھی کم خرچ کیا جاتا ہے کیونکہ بجٹ کا بڑا حصہ ڈیفنس اور قرضوں کی ادیگی میں چلا جاتا ہے (مسئلہ کشمیر کھڑا کرنا اور کھڑا رکھنا اور پاکستان کو ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے شکنجے میں پھانسنا، دونوں مغرب کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہیں) جو بجٹ باقی بچتا ہے وہ کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج آزادی کے ٦٦ سال بعد بھی (۲۰۱۳ء میں) پاکستان میں شرح خواندگی ۳۰، ۳۵ فیصد سے زیادہ نہیں اگرچہ حکومت ٦٠ فیصد کا دعوی کرتی ہے۔

- کمرشلائزیشن یعنی تعلیم کو کاروبار اور مال تجارت بنا دینا حالانکہ یہ پیغمبرانہ مشن ہے اور مسلم معاشرے میں یہ ہمیشہ خدمت (Service) کا شعبہ رہا ہے۔ اس سے نہ صرف تعلیم مہنگی ہوگئی ہے بلکہ شرح خواندگی کم ہوگئی ہے اور اس سے بنیادی اسلامی اقدار کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ اب اساتذہ ملازم اور نوکر سمجھے جاتے ہیں۔ طلبہ سے بھاری فیس لی جاتی ہیں، اساتذہ نے ٹیوشن سنٹر کھول رکھے ہیں، طلبہ و اساتذہ میں

احترام کا رشتہ ختم ہو گیا ہے، تربیت طلبہ کا تصور مرجھا گیا ہے۔۔۔۔

اس مختصر تجزیے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ پاکستان میں اس وقت تعلیم کی جو حالت ہے وہ ایک سچے مسلمان اور پاکستانی کے لیے نا قابل قبول ہے کیونکہ یہ ایک مسلمان بچے کو نہ سچا مسلمان بنانے میں معاون ہے اور نہ سچا پاکستانی کیونکہ پاکستان تو قائم ہی دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہوا تھا اور نظریۂ پاکستان اسلام کے علاوہ کچھ نہ تھا، کیونکہ تقسیم ملک کے جواز کے لے مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنے نظریہ حیات اور اس پر عمل کی وجہ سے الگ تمدن اور تہذیب کے مالک ہیں اور ہندوؤں سے الگ قوم ہیں لہذا ان کے لیے الگ وطن ضروری ہے جہاں وہ اپنے اصول و اقدار کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ موجودہ نظام کی اصلاح اور اسے صحیح خطوط پر منظم کرنے کے لیے دو بنیادی اقدامات کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ اسلامی تعلیمات، تقاضوں اور امنگوں کے مطابق نظام تعلیم کی اس طرح اسلامی تشکیل نو کی جائے کہ وہ ہمارے آج کے معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرے اور دوسرے یہ کہ ایسا کرتے ہوئے مغربی فکر و تہذیب کی بالا دستی کو رد کر دیا جائے کیونکہ اس کا خلاف اسلام ہونا اور اس کے علمبرداروں کا مسلم دشمن ہونا اظہر من الشمن ہے۔ (اہل مغرب اور ان کے ایجنٹ اور ان کی تہذیب سے مرعوب کئی مسلم دانشور اس امر کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اپنی اکثر تحریروں میں اس نکتے کو واضح کیا ہے۔ یہاں ہم تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں)

یہ طے کرنے کے بعد کہ کرنے کا بنیادی کام کیا ہے اب ہمیں اس پر سوچنا ہے کہ اسے کرنے کا طریقہ

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے　　　تاحیات 5000 روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ و طالبات کے لیے　　　250 روپے سالانہ

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ B-369، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

کیا ہوگا اور اسے کون کرے گا؟(جاری ہے)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

Rethinking Education کے عنوان سے کراچی میں ایک اہم تعلیمی کانفرنس

موجودہ تعلیمی نظام محتاج نظر ثانی ہے

قبول مغربیت اور'تقدیس بچہ' پروگرام

ایجوکیشنل ریسورس ڈویلپمنٹ سنٹر (ERDC) کراچی کا ایک اہم تعلیمی مرکز ہے جو سکولوں کو مشاورتی و تربیتی خدمات مہیا کر رہا ہے۔اس سنٹر نے ۷ اپریل ۲۰۱۳ء کو کراچی میں ایک کانفرنس منعقد کی جس کا عنوان'Rethinking Education' تھا یعنی تعلیم سے متعلق تصورات و مناہج پر نظر ثانی اور غور و فکر۔ یہ کانفرس کراچی کے ایک بڑے تعلیمی ادارے'جنریشن سکول' کے تعاون سے منعقد کی گئی جس میں چالیس کے قریب ایسے سکولوں نے شرکت کی جو تعلیم میں اسلامی اصول و اقدار کا لحاظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کانفرنس کے پروگراموں کو تین بڑے اجزاء میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے کچھ اہم سکولوں کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنے اہداف،طریق کار اور حاصلات کے بارے میں شرکاء کو بتائیں۔دوسرے مرحلے میں ایک گروپ ڈسکشن کے ذریعے شرکاء کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ عمومی تناظر میں اس بات پر غور کریں کہ جن

نظریاتی اہداف کو حاصل نہیں کیا جاسکا اس کے اسباب وعلل کیا ہیں۔تیسرے مرحلے میں ماہرینِ تعلیم کے ساتھ ایک پینل ڈسکشن رکھی گئی جس میں شرکاء کو سوال وجواب کا موقع دیا گیا۔راقم کو سنٹر نے یہ اعزاز بخشا کہ اس کانفرنس میں بطور مہمان خصوصی بلایا اور پرگراموں کے آخر میں اظہار خیال کا موقع دیا۔

یہ ایک عمدہ کانفرنس تھی۔نظم وضبط اور انتظامات معیاری تھے۔سکولوں نے جوش وخروش سے اس میں حصہ لیا۔بعض سکول استفادے کی غرض سے اپنے سارے اساتذہ کو لے کر آئے تھے۔۹ بجے سے ۵:۳۰ بجے تک شرکاء کی فعال شرکت نے اس کانفرنس کو دلچسپ اور مفید بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ہم اس اہم تعلیمی کانفرنس کے کامیاب انعقاد پر ERDC کے روح رواں جناب سلمان آصف صدیقی صاحب اور ان کی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتے ہیں البتہ اہل دانش کی توجہ دو امور کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں:

تعلیم میں قبول مغربیت

ہمارے ہاں شعبہ تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ اسلام اور نظریۂ پاکستان (اور پاکستانیت) کے تقاضوں کے مطابق نہیں اور مغربیت (Westernization) کا شکار ہو چکا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ نظریاتی تشخص اور مقامی رنگ (Indigenous Character) سے محروم ہو چکا ہے اور مغربیت کو اپنا چکا ہے۔اب جو لوگ تعلیم کی اصلاح چاہتے ہیں ان کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالیں (Islamization of Education) اور مغربیت کو رد کریں (Dewesternization of Education)۔مغربی فکر وتہذیب کا خلاف اسلام ہونا اور اہل مغرب کا مسلم دشمن ہونا اظہر من الشمس ہے (لیکن اہل مغرب اور ان کی فکر وتہذیب سے مرعوب مسلمان اس امر کو مشتبہ بنانے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں لہذا اس کے خلاف دلائل ہماری اکثر کتابوں میں موجود ہیں۔[یہاں ہم انہیں اس لیے نہیں دہراتے کہ یہ تبصرہ طویل ہوجائے گا اور ہم موضوع سے دور چلے جائیں گے۔])۔

جن لوگوں نے سکول بزنس کے طور پر کھول رکھے ہیں وہ یہ کرتے ہیں کہ تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے نام پر ایک آدھ سطحی اور ظاہری (showy) قسم کا کام کرتے ہیں (جیسے حفظ قرآن) اور اسلامی تعلیم کا سلوگن اور نعرہ زور شور سے لگاتے ہیں تا کہ اسلام پسند والدین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں لیکن تعلیم کی مغربیت کو بھی رد نہیں کرتے۔تعلیم کی ویسٹرنائزیشن (جیسے مخلوط تعلیم، انگلش میڈیم، غیر مسلم و غیر پاکستانی مصنفین کا مرتب کردہ نصاب [بشمول میوزک وڈانس وغیرہ] اور نصابی کتب، غیر مسلم ممالک کا

نظامِ امتحان (او، اے لیول) اور مغربی معاشرے سے ہم آہنگ ہم نصابی سرگرمیاں (جیسے اہل مغرب کی سی یونیفارم، ٹیبلو، ڈرامے، کنسرٹ (موسیقی ورقص) مخلوط پکنک اور تعلیم کی کمرشلائزیشن وغیرہ) کو قبول کرتے ہیں اور یہ عذر لنگ پیش کرتے ہیں کہ "کیا کریں عوام کا رجحان اسی طرف ہے"۔

سوال یہ ہے کہ عوام کے رجحان کو کون بدلے گا اور کیسے بدلے گا؟ جب آپ تعلیم کو کاروبار سمجھتے ہیں اور تعلیم میں وہی کچھ دینا چاہتے ہیں جو مارکیٹ چاہتی ہے تو پھر اسلام کا سلوگن چہ معنی دارد؟ اگر ان احباب سے پوچھا جائے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ اپنے رویے کو فلاسیفائز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حکمت دعوت وتبلیغ ہے کہ لوگ تو مغربی طرز کی تعلیم چاہتے ہیں لیکن ہم انہیں تھوڑی سی اسلامی تعلیم بھی دیتے ہیں تاکہ وہ بدک نہ جائیں۔ یا وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مجبور ہیں کہ والدین خود اوکسفورڈ کی کتابیں اور او و اے لیول کا امتحان دلانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس کا انتظام نہ کریں تو وہ اپنے بچوں کو ہمارے سکول میں داخل نہیں کرائیں گے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ مسلم روایت میں تعلیم کبھی مال تجارت نہیں رہی۔ یہ تو اسوۂ پیغمبری ہے جس سے وہ لوگوں کی اصلاح اور ہدایت کا کام لیتے تھے اور انہیں اسلام کی راہ پر چلاتے تھے اور ساتھ ریاست اور معاشرے کی دینی ودنیاوی ضرورتیں بھی پوری کرتے تھے۔ اور یہ کہ دنیا کی ہر قوم نے چین، جاپان، جرمنی اور امریکہ ۔۔۔۔نے ترقی اسی طرح کی ہے کہ تعلیم اپنی زبان میں ہی دی ہے اور اپنے معاشرے کے اعتقادات اور ضرورتوں کے مطابق دی ہے لیکن آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ دوسرے معاشروں کی زبان اور ان کی تعلیم کی اندھی تقلید کر رہے ہیں اور بیوقوفوں کی طرح اسے اپنا رہے ہیں۔ اگر لوگوں کی سوچ غلط ہے تو آپ کا کام ان کی اصلاح کرنا ہے نہ کہ ان کی غلط خواہشوں کو پورا کرنا۔

اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس رویے کے پیچھے مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت چھپی ہے اور وہ اس مغالطے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں کہ "ترقی یافتہ" قوموں کے نظام تعلیم کی پیروی کرنے سے وہ بھی ترقی کریں گے اور ان کا معاشرہ بھی ترقی کرے گا۔ نیز وہ ہر صورت میں اپنے تعلیمی "کاروبار" کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں اور ان کے پیش نظر صرف پیسہ ہے، صرف دنیا ہے لہذا وہ اس "کاروبار" میں حلال وحرام کی پروا نہیں کرتے۔ اگر کرتے ہوتے تو یہ سمجھنا کیا مشکل تھا کہ مسلمان طلبہ کو نامسلمان بنانا گناہ کبیرہ ہے، یہ انہیں قتل کرنے کے مترادف ہے۔ مسلمان بچوں کو مغربی طرز کی تعلیم دینا، ان کی مغربی طرز کی تربیت کرنا اس تعلیمی تجارت کو حرام بنا دیتا ہے لیکن یہ لوگ دھڑلے سے اسلام کے نام پر مغربی طرز کی تعلیم دے رہے ہیں جو بعض لوگوں کے نزدیک ظلم اور منافقت ہے اور منافقت قرآن کی رو سے کفر سے بھی بدتر ہوتی ہے اور ایسے لوگوں کا ٹھکانہ قرآن کی رو سے 'اسفل السافلین' یعنی جہنم کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ اللہ تعالی سب مسلمانوں کو اس سے بچائے۔

تقدیس بچہ پر گروام

اس کانفرنس کی اہم خصوصیت وہ 'تقدیس بچہ' پروگرام ہے جس کی حمایت اور ترجمانی ERDC کے سربراہ جناب سلمان صدیقی صاحب نے دوران کانفرنس اپنی تقریروں میں کی بلکہ کانفرنس کے اختتام پر مندرجہ ذیل پانچ نکات کی صورت میں اپنا 'تقدیس بچہ' پروگرام یا منہج بطور ڈیکلریشن شرکاء سے منظور کرایا :

۱۔ بچوں کے ہر طرح کے سوالات کے جوابات غصہ میں آئے بغیر دیجیے

۲۔ اپنے بچے کا تقابل کبھی دوسرے بچوں سے نہ کیجیے

۳۔ بچوں کو غیر مشروط عزت دیجیے

۴۔ بچوں کو بیرونی ترغیب، مشوروں اور نصیحتوں سے بچایئے

۵۔ بچوں کو اپنی داخلی قوت سے سیکھنے اور بڑھنے دیجیے

جن لوگوں نے مغربی فکر و تہذیب کا مطالعہ کر رکھا ہے وہ ایک لحظہ میں جان جائیں گے کہ یہ ''تقدیس بچہ'' پروگرام اس ہیومنزم پر مبنی ہے جو مغربی تہذیب کی فکری اساس ہے، جس کی ابتداء تکریم انسان کے تصور سے ہوئی اور انتہاء انکار خدا اور انسان کو خدا بنانے پر[۱] انسان کی لامحدود اور غیر مشروط آزادی (ہماری زبان کے محاورے میں مادر پدر آزادی) اور خودمختاری مغرب کے تصور انسان کا لازمی حصہ ہے۔ اسی کی رو سے مغربی معاشرے میں سزائے موت ختم کر دی گئی ہے۔ ہر فرد آزاد ہے کہ جتنا اور جیسا لباس چاہے پہنے، عورت اور مرد کو جنسی تعلق قائم کرنے کی آزادی ہے، بغیر نکاح کے بچے پیدا کرنے کی آزادی ہے۔ فرد چونکہ خودمختار ہے لہذا اس کے نمائندے پارلیمینٹ میں جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام قرار دے سکتے ہیں چنانچہ اکثر مغربی ممالک کی پارلیمانوں نے جوئے، شراب، زنا، ہم جنس شادی وغیرہ کو حلال قرار دے دیا ہے۔ مذہب فرد کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور ریاست و معاشرے کا نظام مذہب کی بنیاد پر نہیں چلایا جاسکتا۔ انسان کی اس لامحدود آزادی اور خودمختاری کے تصور کا اثر مغرب کے ''تصور بچہ'' پر بھی پڑتا ہے چنانچہ وہاں والدین اور اساتذہ کو بچے کو مارنے کا حق نہیں اور اگر وہ ایسا کریں تو وہ پولیس کو بلا کر انہیں گرفتار کرا سکتا ہے اور بالغ ہو جائے تو والدین کا اختیار اس پر سے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ERDC کے سلمان صدیقی صاحب نے جو ''تقدیس بچہ'' پروگرام پیش کیا ہے وہ ہیومنزم اور مغرب کے تصور بچہ کے عین

(۱) ہماری کئی تحریروں میں نیٹشے اور سارتر کے ان اقوال کے حوالے موجود ہیں جن میں وہ خدا کا انکار اور انسان کو خدا بنا کر پیش کرتے ہیں

مطابق ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگرچہ ہمارے ہاں بچوں کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہوتا اور اس پر توجہ کی ضرورت ہے لیکن اس کے باوجود پاکستان جیسے مسلم معاشرے میں مغرب کے تصور بچہ کو مطابق اسلام کہہ کر پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے اور مذکورہ ہیومنزم پر مبنی تصورات کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ اسلام کے اپنے اصول واقدار ہیں۔ اپنا فلسفۂ زندگی ہے، جو حکمت ودانش سے بھرپور ہے۔ یہاں بھی فرد کو آزادی ہے، فرد کی تکریم ہے لیکن حدود کے اندر کہ انسان، اسلام کی رو سے مادر پدر آزاد وخود مختار نہیں بلکہ اللہ کا عبد ہے اور عبد کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو اپنے آقا ومولا کے احکام کی غیر مشروط اطاعت کرے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ یہ احکام انسانی فطرت وضرورت کے عین مطابق ہوں اور حکمت ودانش سے لبریز ہوں۔ ان احکام کی رو سے بعض ناگزیر حالات میں قرآن حکیم بیوی کو اور صحیح احادیث بچے کو سزا دینے کی اجازت دیتے ہیں ۔

آزادی اور تکریم انسانیت کا اسلام کا اپنا فلسفہ ہے جس کا کچھ ذکر ہم نے البرہان کے شمارہ مارچ 2013ء میں بھی کیا ہے جہاں ہم نے پاکستان کے ان احمق حکمرانوں (سیاستدانوں، بیوروکریٹس ۔۔۔) پر تنقید کی تھی جنہوں نے طلبہ کو سزا دینے پر اساتذہ کو قید اور جرمانے کی سزا کا بل پاس کیا تھا۔

حرف آخر

اس تبصرے اور تنقید سے ہمارے پیش نظر ERDC جیسے وقیع ادارے اور ان اسلامی سکولوں کی حوصلہ شکنی مقصود نہیں جو اپنے ہاں اسلامی اصول واقدار پر عمل کی کچھ کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ویسٹرنائزیشن کی مضبوط لہر کا، جو سیلاب کی صورت اختیار کر چکی ہے اور پاکستانی معاشرے کو اپنے

تجدید اور تقلید

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ِ ایجاد کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

اقبالؒ

ساتھ بہائے لے جارہی ہے، مقابلہ کررہے ہیں اور ان حالات میں اسلامی اصول واقدار کی پاسداری کا علم لے کر کھڑے ہوئے ہیں وہ ہماری ستائش اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ انہیں متحد ہونے اور مضبوط ہو کر مزید آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کی فکر وتہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور کسی غالب تہذیب کا مقابلہ کرنا یا اس کی مخالفت کرنا آسان کام نہیں ہوتا اور اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ومرعوب ہو جانا بھی

جناب مدیر البرہان!

مجھ آپ کے دینی وسیاسی موقف سے تو زیادہ اختلاف نہیں لیکن آپ کے اسلوب اور طریق کار سے مجھے سخت اختلاف ہے خصوصاً آپ جس طرح لیے دیے انداز میں بلکہ منمناتے ہوئے علمائے کرام اور دینی عناصر کی خدمت میں گزارشات پیش کرتے ہیں، اس سے مجھے بہت جلن ہوتی ہے۔ آپ بہادر بنیں اور سچی بات کہنا سیکھیں اور اگر آپ میں سچ لکھنے کی ہمت نہیں تو میری تحریریں شائع کریں۔

پروفیسر طارق بٹ

قابل فہم ہے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی اصولوں اور ان کی حکمتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور ان پر عمل کی کوشش کی جائے اور مغربی فکر وتہذیب کی کمزوریوں اور اس کے خلاف اسلام اور رویوں کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور انہیں شعوری قوت سے اور دلائل کی بنیاد پر رد کیا جائے۔

ہم ایک دفعہ پھر ERDC کو ’Rethinking Education‘ کے موضوع پر اس شاندار کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان سکولوں کو بھی مبارکباد دیتے ہیں جنہوں نے اس کانفرنس سے استفادہ کیا اور اپنی سمجھ کے مطابق تعلیم میں اسلامی اصول واقدار کی پیروی پر زور دیا اور اس کا عہد لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان کاوشوں کو قبول فرمائے (آمین)۔

حالاتِ حاضرہ

پروفیسر طارق بٹ

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں عبرت کیوں نہیں پکڑتیں؟

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں عبرت کیوں نہیں پکڑتیں؟

۱۔ ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف نے دینی سیاسی جماعتوں (بالخصوص جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام (ف) اور مرکزی جمعیت اہل حدیث وغیرہ) سے سیٹ ایڈجسمنٹ سے انکار کر دیا ہے اور وہ اب یوسف بے کارواں ہو کر پھر رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں کیوں نہیں سوچتیں کہ ان کی اس بے وقعتی، ناقدری بلکہ ذلت کا سبب کیا ہے؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کا کوئی وزن نہیں۔ جب وہ ایم ایم اے کی صورت میں متحد ہو گئی تھیں تو عوام نے اسے پسند کیا، ووٹ بھی دیے اور ان کی اہمیت بھی بڑھ گئی لیکن مولانا فضل الرحمان صاحب نے بزعم خود ہوشیاری وعیاری سے کام لیتے ہوئے بے اصولی کی اور ذاتی مفادات اٹھائے (پہلے مشرف سے اور پھر زرداری سے) چنانچہ اب کے جماعت اسلامی نے ان کے ساتھ اتحاد سے انکار کر دیا۔ ایم ایم اے کی باقی جماعتوں کی کوئی انتخابی حیثیت نہیں اور اصل پارٹنر یہی دو تھے لہٰذا اتحاد نہ ہو سکا۔ اتحاد نہ ہوا تو اہمیت اور وزن بھی نہ رہا۔

۲۔ عوام یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر دینی جماعتیں نفاذ شریعت میں مخلص ہیں (جو اُن کا واحد یا سب سے بڑا ایجنڈا ہے) تو وہ اکٹھی کیوں نہیں ہو جاتیں؟ ان کے اکٹھا نہ ہونے کا مطلب خود بخود یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی کاز سے مخلص نہیں۔ ہر مسلک اور فرقے کے ہوشیار لیڈر نے مسلک کی بہتری کا جھانسا دے کر اپنے ہم مسلک افراد کو ملا کر ایک پارٹی بنا رکھی ہے بلکہ ہر فرقے کے اندر کئی جماعتیں ہیں گویا جتنے لیڈر اتنی جماعتیں اور اسلام کا محض نام استعمال ہوتا ہے حالانکہ یہ فرقہ واریت خود خلاف اسلام ہے اور مولوی صاحبان اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ عمل اتنی دفعہ دہرایا جا چکا ہے کہ عوام اب اس کھیل سے تنگ آ گئے ہیں چنانچہ ہمارا اندازہ ہے کہ اس دفعہ انتخابات میں ان دینی سیاسی جماعتوں کا بالکل صفایا ہو جائے گا اور انہیں کوئی ووٹ نہیں دے گا۔

۳۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری سیاسی جماعتیں مغرب کے سیکولر ایجنڈے کے مطابق کام کرتی ہیں اور ہر جماعت امریکہ و یورپ کو کنگ میکر سمجھ کر اس کی خوشنودی کی طالب اور اس کے مفادات کے لیے کام کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔موجودہ حالات سے نظر آرہا ہے کہ کہ زرداری اور اس کے اتحادیوں کے بعد اب مسلم لیگ (ن) نے امریکہ کو اپنی وفاداری کی یقین دہانی کرا دی ہے اور تحریک انصاف نے بھی اسے یقین دلایا ہے کہ وہ اس کی مخالفت میں دور تک نہیں جائے گی لہذا دونوں کو امریکی اشیر باد حاصل ہے۔ یہ بات بھی ان کی بظاہر مقبولیت کے پس منظر میں موجود ہے لیکن ہمارا سوال سیاسی و دینی جماعتوں سے یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے میدان مار لینے کے لیے اتنی محنت کی ہے جتنی مثلاً عمران خان نے نوجوانوں پر کام کر کے اور تبدیلی کے نعرے کے لیے کی ہے یا ان میں سے کس نے اتنی محنت کی ہے جتنی نواز شریف نے علاقائی جماعتوں کو جیتنے کے لیے کی ہے؟ حالانکہ عوام اسلام پسند اور امریکہ مخالف ہیں اور اگر دینی سیاسی جماعتیں متحد ہو کر امریکہ مخالف عناصر کو اکٹھا کر کے ڈھب سے تحریک چلاتیں،سوشل میڈیا کو متحرک کرتیں،عوام کو متحد کرتیں تو وہ انتخابی قوت بن سکتی تھیں لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا سوائے آپس میں لڑنے کے۔لہذا عوام یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ مولوی اس قابل ہی نہیں کہ ان کو ووٹ دیا جائے۔نہ یہ تھانے کچہری میں کام آسکتے ہیں، نہ تقرر و تبادلے میں مدد کر سکتے ہیں اور نہ ان کو معیشت وتجارت اور بین الاقوامی حالات کی کچھ خبر ہے تو پھر بہتر ہے کہ یہ مسجد کی امامت ہی کا کام کریں اور بچوں کو قرآن پڑھا دیا کریں۔

آئین کی اسلامی دفعات کا مذاق

ہماری سیاست کا المیہ یہ ہے کہ یہ مغرب کی جمہوریت اور سیکولرزم کو قبول کر چکی ہے۔دوسری طرف اس کی مشکل یہ ہے کہ ملک کی ۹۶ فیصد آبادی مسلمان ہے اور وہ فطری طور پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتی ہے۔اس صورت حال نے پاکستانی حکمرانوں کو منافقت کی راہ پر ڈال دیا ہے یعنی وہ بظاہر تو نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن اندر سے مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ریاست اور معاشرے کو چلانا چاہتے ہیں۔نہ ان کی ذاتی زندگی میں اسلام ہے اور نہ وہ اجتماعی زندگی میں اسے لاگو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دورخی ،دو چہرگی اور منافقت عجیب رنگ دکھلاتی ہے۔نواز شریف صاحب شریعت آرڈیننس لانے کا اعلان کرتے ہیں اور اب عمران خان صاحب نے ایاک

نعبد و ایاک نستعین کو ماٹو بنا لیا ہے حالانکہ اسلام کی سیاسی، معاشی معاشرتی، تعلیمی، قانونی اور عدالتی تعلیمات پر عمل کا نہ ان میں سے کسی کا ارادہ ہے اور نہ اہلیت۔

ہماری سیاست میں حال ہی میں یہ مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی کہ پہلے ایک مداری کے ذریعے سیاسی نظام کو اسلامی بنانے خصوصاً دستور کی دفعہ ۶۲، ۶۳ پر عمل کرنے کا ڈھول پیٹا گیا چنانچہ الیکشن کمیشن اور اعلیٰ عدالتوں نے بھی اس کی موافقت کا عندیہ دیا لیکن عملاً صرف یہ ہوا کہ ریٹرننگ افسروں نے نماز جنازہ اور دعائے قنوت سننے جیسے ’’عظیم کارنامے‘‘ سرانجام دیے اور اس کے بعد ہر چور اچکا، جھوٹا، فراڈیا، ٹیکس نہ دینے ولا، بل نہ دینے والا، قرض نہ واپس کرنے والا، جھوٹی ڈگریاں جمع کرانے والا سب ۶۲، ۶۳ کی چھلنی سے بخیر وخوبی گزر گئے اور صادق وامین ٹھہرے۔ یاللعجب!

پہلے ایک ۔صاحب نے گریجوایشن کی شرط لگائی اور اس کا حشر دیکھ کر قانون واپس لے لیا۔ اب خدشہ ہے کہ دفعہ ۶۲، ۶۳ کی چھلنی سے بدمزہ ہونے والے امیدوار جب اسمبلی میں پہنچیں گے تو ممکن ہے اس آئینی دفعہ ہی کو بدلنے کی کوشش کریں۔

ہے کوئی جو ان سیکولرسٹوں اور دنیا و دولت کے پجاریوں کی ایمانی حالت کی درستی کے لیے کوشش کرے؟ دلوں کو بدلنے والے داعی اور صوفی کہاں چلے گئے؟ ہماری دینی سیاسی جماعتیں تو ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حالات حاضرہ

اشتیاق احمد٭

آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پنجاب کے نظام تعلیم کو غیر اسلامی بنانے اور تباہ کرنے کے جرم میں

میاں شہباز شریف کو نااہل قرار دیا جائے

☆ سینئر ماہرِ مضمون طبیعیات گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول 135/10-R تحصیل جہانیاں ضلع خانیوال (پنجاب) فون: 0301-7576815

میں پاکستان کے چیف الیکشن کمشنر اور چیف جسٹس آف پاکستان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ میاں محمد شہباز شریف کو انتخابات میں حصہ لینے سے نااہل قرار دیں کیونکہ آئین کی دفعہ ۶۲، ۶۳ پر پورا نہ اترنے کے علاوہ انہوں نے تعلیم کے حوالے سے اسلامی تعلیمات اور آئین پاکستان کی متعدد دفعات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ انہوں نے دستور پاکستان کی دفعہ ۲۵۱ کی خلاف ورزی کی ہے جو اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیتی ہے اور انگریزی کی بجائے اردو پر عمل درآمد کے لیے ۱۵ برس کا عرصہ مقرر کرتی ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سابق وزیر اعلیٰ صاحب نے پنجاب کے تمام سرکاری سکولوں کو انگلش میڈیم بنا دیا ہے۔ اردو نصاب پڑھانے پر پابندی لگا کر جبراً مفت مگر مشکل، ناقابلِ فہم اور بچوں کی ذہنی سطح سے ماورا انگریزی میں کتابیں فراہم کر کے پوری نسل کو ذہنی مریض بنا دیا ہے۔

۲۔ انہوں نے دستور کی دفعہ ۲۸ کی خلاف ورزی کی ہے جو شہریوں کو زبان، رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ کا حق دیتی ہے اور اس شق کے مطابق دیگر صوبوں کی طرح پنجاب کے بھی ہر شہری کو حق ہے کہ وہ اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرے۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے پنجاب کے ہر شخص سے اس کا بنیادی حق، جو اسے اس ملک کا آئین دیتا ہے، چھین لیا ہے یہاں تک کہ پورے پنجاب سے اردو میڈیم نصاب اور اردو میڈیم سکولوں کو ہی ناپید کر دیا ہے۔ اب کوئی شخص اگر پنجاب میں اردو میڈیم سکول کھولتا ہے تو اسے کتابیں دستیاب نہیں ہیں اور وہ اردو میں امتحان نہیں دے سکے گا۔ علاوہ ازیں سکولوں میں تین دن اسمبلی بھی انگریزی میں کروانے کے احکامات جاری کیے ہیں۔ زبان کے علاوہ لباس بھی کسی قوم کے افراد کی تہذیبی اور شناختی علامت ہوتا ہے۔ پنجاب کے تمام سرکاری سکولوں میں شلوار قمیض ختم کر کے طلبہ کو جبراً پینٹ شرٹ پہننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نے آئین کی اس دفعہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے طلبہ کو ان کی زبان

،لباس اور ثقافتی شناخت برقرار رکھنے کے حق سے محروم کر دیا ہے۔

۳۔ دستور کی دفعہ ۳۱ میں قرآن حکیم اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے ساتھ ساتھ عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کے لیے سہولیات بہم پہنچانے کا ذکر ہے۔ حکومتِ پنجاب نے کمپیوٹر کے ذریعے عربی کو سکولوں سے بے دخل کرنے اور پہلے سے موجود سہولتوں سے بچوں کو بے بہرہ بنانے کی دانستہ کوششیں کیں۔ محکمہ تعلیم کے انتظامی افسران کو سرکاری چھتری تلے سامراجی مقاصد کے لیے بطور آلہ کار استعمال کیا تا کہ اُردو میڈیم، اسلامیات اور عربی کی اہمیت کو کم کیا جا سکے۔ سٹاف ڈویلپمنٹ

ڈائریکٹوریٹ میں عربی اور اسلامیات کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر لیبارٹریاں بنا کر کمپیوٹر کی کتابیں انگریزی میں فراہم کیں جن کا پڑھانا نہ کسی استاد کے بس کی بات ہے اور نہ پڑھنا کسی بچے کے بس میں۔

۴۔ آئین کی دفعہ ۱۹ کے تحت پاکستان کے ہر شہری کو (چاہے وہ سرکاری ملازم ہو یا کسی اور پیشے سے وابستہ) تقریر اور اظہارِ خیال کا حق دیا گیا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر تعلیمی پالیسیوں پر اختلاف رائے کا کھل کر اظہار کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ اظہار پالیسی ساز اداروں اور ان سے وابستہ افراد کے سامنے ہی ہوسکتا ہے مگر پنجاب میں گذشتہ پانچ سالہ ''جمہوری دور'' میں پرائمری اور مڈل سکول اساتذہ کو اس قدر ہراساں اور زیرِ دباؤ رکھا گیا جس کی مثال شائد کسی آمریت کے دور میں بھی نہ ملے۔ انگلش میڈیم، مخلوط تعلیم اور دیگر سامراجی پالیسیوں کو جبراً نافذ کرانے کے لیے ریاستی مشینری کو پوری طاقت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ ضلعی رابطہ افسران (ڈی سی اوز) کے ذریعے اساتذہ کی رخصتِ اتفاقیہ پر پابندی لگائی گئی تاکہ اساتذہ کو نام نہاد تعلیمی پالیسیوں پر احتجاج سے روکا جائے۔ اس اقدام کے ذریعے اساتذہ کو سربراہانِ ادارہ کے مدِ مقابل لاکھڑا کیا گیا۔ نفرتوں کو بڑھاوا دے کر باہم الجھا کر سامراجی مقاصد کو پورا کیا گیا۔ ڈپٹی ڈی اوز اور اے ای اوز پنجاب کے ہر پرائمری اور مڈل سکول کے اساتذہ کو موجودہ نصاب اور نظامِ تعلیم پر اختلاف کرنے سے سختی سے منع کرتے رہے اور خلاف ورزی کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے رہے۔ اپنی ماہانہ میٹنگوں میں بھی ایسی ہی ہدایات دیتے رہے اور ملازمت سے فارغ کرنے کا خوف دلاتے رہے۔ اس بات کی گواہی ہر سکول کا ہر استاد دینے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اس پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔ یہ جبر نام نہاد خادمِ اعلیٰ کی ہدایت ہی پر کیا جاتا رہا جو سامراجی پالیسیوں پر عملدرآمد کرانے میں سب سے آگے ہیں۔

مارچ ۲۰۱۳ میں سپریم کورٹ نے گھوسٹ سکولوں کی نشاندہی کرنے اور سکولوں پر قبضہ کی معلومات فراہم کرنے کے لیے ججوں کو سکولوں میں بھیجا تو بھی ڈپٹی ڈی ای اوز متحرک ہوئے اور اساتذہ کو ججوں کے سامنے خاموش رہنے کی نصیحت کرتے رہے اور درست صورتِ حال پر پردہ ڈال کر پنجاب حکومت کو سبکی سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ ظاہر ہے حکامِ بالا کے افسران کی ہدایات کے بغیر تو یہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔

اساتذہ کے تربیتی کورسز میں معلمین و معلمات کو خوب ہراساں کیا گیا۔ یہ کورسز غیر ملکی امداد سے کرائے گئے اور ان کا بڑا مقصد ذہنی تطہیر (brain washing) تھا جس میں انگلش میڈیم اور مخلوط تعلیم کے جبری نفاذ کی راہ ہموار کرنا مقصود تھا۔ اس مقصد کے لیے پنجاب کی پوری تعلیمی مشینری کو استعمال کیا گیا

تا کہ قوم کا استاد اور بچے سامراجی زہر پینے پر آمادہ ہو جائیں اور احتجاج کرنے کے سنگین نتائج کی دھمکیاں اساتذہ کو خوف، سراسیمگی اور دباؤ میں رکھیں۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے پنجاب کے اساتذہ کو ٹریننگ کورسز میں جبراً انگریزی بولنے پر مجبور کیا جاتا رہا اور اس کے لیے سرکاری مشینری کا بھرپور استعمال کیا جاتا رہا۔ نئے بھرتی ہونے والے ایجوکیٹرز کو بھی ٹریننگ کے دوران یہ باور کرایا جاتا رہا کہ ان کی بھرتی صرف انگلش میڈیم کو پڑھانے کے لیے کی گئی ہے لہٰذا وہ اس کے خلاف بات مت کریں۔ اساتذہ کی زباں بندی کے لیے ریاستی جبر کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی؟ نام نہاد خادمِ پنجاب اور دیگر سامراجی ایجنٹ اگر عوام سے ووٹ بھی انگریزی میں مانگیں اور پینٹ شرٹ پہن کر مانگیں تو ان کو اپنے پاگل پن کا شائد احساس ہو جائے جس کا جبراً مظاہرہ سکولوں میں کیا جا رہا ہے۔

۵۔ آئین کی دفعہ ۵ میں ہر پاکستانی شہری کو شخصی آزادی اور انتخاب کی آزادی حق دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو بھی کوئی ایسا کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا جس کا کرنا اس کے لیے قانونی طور پر ضروری نہ ہو۔ اس دفعہ کی رو سے جن امور کی قانون میں اجازت ہے انہیں اگر حکومت کالعدم قرار دے دے تو یہ مذکورہ تمام آزادیوں کو سلب کرنے کے مترادف ہے لہذا اردو میڈیم کا آپشن ختم کرنا، شلوار قمیض پہننے پر پابندی لگانا، سکولوں میں ستر فیصد بچوں کو سائنس پڑھنے پر مجبور کرنا، اساتذہ اور بچوں کو مخلوط نظامِ تعلیم میں پڑھنے پر مجبور کرنا، ٹریننگ پروگراموں میں انگریزی بولنے پر مجبور کرنا یہ تمام اقدامات قانون کے ذریعے دی گئی آزادی کی مزاحمت اور ممانعت کے زمرے میں آتے ہیں۔ حکومت جبراً ان قانونی آزادیوں کو سلب کر کے آئینِ پاکستان کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ یہ دفعہ ۱۹ کی بھی خلاف ورزی ہے جس میں تقریر اور اظہار کی آزادی کا ہر شخص کو حق دیا گیا ہے۔ اظہار کے لیے انگریزی بولنے کی پابندی لگانا اظہار کو مشکل اور پیچیدہ بنانا ہے جو کہ آئین کی واضح خلاف ورزی ہے۔

۶۔ آئین کی دفعہ ۲۵ الف کی رو سے ریاست، مملکت کے پانچ سے پندرہ سال کے تمام بچوں کو مفت تعلیم دینے کی پابند ہے۔ اگر ریاست آئین کی اس دفعہ کی پابندی کرے تو اسے غریبوں اور امیروں کے تمام بچوں کو بلا تفریق تعلیم مفت دینا ہوگی پھر یہ بڑے بڑے سکول سسٹم جو ہزاروں روپے ماہانہ فیس لیتے ہیں ان کی اجازت کس قانون کے تحت دی گئی ہے؟ جب تعلیم کی فراہمی کی مکمل ذمہ دار ریاست ہے تو پرائیویٹ مافیا، وزیروں، مشیروں اور سرمایہ داروں کے سکول سسٹم کو سرکاری چھتری کے نیچے کیوں پروان چڑھایا جا رہا ہے؟ اے لیول اور او لیول مافیا کا وجود بھی مفت تعلیم کے اس آئینی فلسفے سے متصادم ہے۔ اس دفعہ کے مطابق سرکاری سکولوں کی تعداد اتنی ہونی چاہیے جو ملک کے تمام بچوں کو بلا تفریق تعلیم دے سکے۔ پرائیویٹ اداروں کو صرف اس صورت میں تعلیم دینے کی اجازت ہو سکتی ہے کہ وہ خدمت کے جذبے سے

مفت تعلیم دیں۔ اگر ایسا ہوتو ان بڑے بڑے مگرمچھوں کے تعلیمی جذبے کی قلعی بھی کھل جائے گی۔

گذشتہ دس سالوں میں پنجاب میں ایک بھی نیا سرکاری سکول نہیں بنا بلکہ پہلے سے موجود سرکاری سکولوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ ایک طرف فیسوں والے سکولوں کو پال پوس کر بڑا کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مفت تعلیم دینے والے سکولوں کا دائرہ محدود سے محدود تر کیا جا رہا ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں نے میٹرک تک مفت تعلیم کے بل کو بھی پاس کیا ہے مگر طرفہ تماشا دیکھیے کہ اس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ مافیا کی بھی بھرپور سرپرستی ہو رہی ہے۔ پوری قوم کو کس ڈھٹائی کے ساتھ بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ حکومت سرکاری نظامِ تعلیم ختم کرنا چاہتی ہے کیونکہ اگر پنجاب حکومت سرکاری نظامِ تعلیم کو ترقی دینا چاہتی تو دانش سکولوں کی بجائے سرکاری سکولوں کی تعداد میں اضافہ کرتی۔ جہاں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے وہاں یہ سہولتیں فراہم کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو واقعی حکومت مفت تعلیم کے فلسفے پر عمل پیرا ہوتی مگر اب اس کی نیت اور عمل کا پول نصف النہار پر چمکتے سورج کی طرح کھل چکا ہے۔

۷۔ دستور کی دفعہ ۵ کی رو سے مملکت سے وفاداری ہر شہری کا بنیادی فرض ہے اور دستور اور قانون کی اطاعت اور تعمیل ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔

عام آدمی سے غلطی ہو جائے تو اسے نشانِ عبرت بنانے کے سارے راستے کھلے ہوتے ہیں مگر مملکتوں کے سربراہان، وزرائے اعلیٰ اور دیگر ممبرانِ اسمبلی آئین و قانون کو پوری طاقت، رعونت اور فرعونیت کے ساتھ پاؤں تلے مسلتے رہیں مگر انہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ یہ جنگل کی ریاست تو ہو سکتی ہے مگر انسانوں کی نہیں۔ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نے جن آئینی دفعات کی خلاف ورزی کی ہے انہیں پڑھ جایئے اور اس دفعہ کے ترازو میں تو لیے تو فیصلہ ہو جائے گا کہ کیا ان دفعات کو پاؤں تلے روندنے والے مملکت کے وفادار ہیں اور کیا ان کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق ہونا چاہیے؟

۸۔ آئین کی دفعہ ۱۹ (الف) کی رو سے ہر شہری کو مفادِ عامہ سے متعلق تمام امور کی بابت معلومات تک رسائی کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا آئین کی مذکورہ دفعہ کی روشنی میں ہر پاکستانی کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے نمائندوں نے کتنے پیسے کن شرائط پر غیر ملکی این جی اوز یا غیر ممالک سے لیے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اور سارے پاکستانیوں کو یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ پنجاب میں مفت کتابیں کس ملک کے پیسوں سے چھپتی ہیں؟ کتابوں کو معیاری بنانے کے نام پر صوبائی (اور وفاقی) حکومت کے کن افراد نے غیر ملکی مداخلت کی راہ ہموار کی؟ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نے مائیکل باربر اور ریمنڈ کو مشیرِ خاص کس قیمت پر بنایا؟ ان دونوں حضرات سے پنجاب میں زنانہ اور مردانہ تعلیمی اداروں کو ضم کرنے کا جو معاہدہ وزیر اعلیٰ پنجاب نے کیا اس کا اصل متن کیا تھا؟ کتنی رقم

کے عوض یہ معاہدہ طے پایا؟ دانش سکولوں میں کن کن ممالک اور کن کن این جی اوز کا پیسہ شامل ہے؟ اساتذہ کی تربیت کی مد میں کن شرائط پر غیر ملکی این جی اوز سے معاہدے کیے گئے؟ ہم کہتے ہیں کہ ان تمام دستاویزات کا متن عوام کے سامنے لایا جائے اور وہ تمام ذرائع بتائے جائیں جن سے تعلیم کے نام پر غیر ملکی پیسہ آتا ہے۔

۹۔ آئین کی دفعہ ۶ آئین پر عمل درآمد نہ کرنے اور قوت سے اسے معطل رکھنے کو ریاست سے غداری قرار دیتی ہے۔ مملکت کے وقار اور وجود کے خلاف کوئی قول و فعل بھی غداری ہے اور ایسے افراد کی معاونت بھی غداری کے زمرے میں آتی ہے اور اس کی سزا موت ہے۔ سوال یہ ہے کہ آئین کی مذکورہ بالا دفعات کی خلاف ورزی کرنا اور غیر ملکی پیسے سے پنجاب میں مخلوط تعلیم کا مائیکل باربر اور ریمنڈ سے معاہدہ کرنا، پورے پنجاب کو انگلش میڈیم بنانا، نصابِ تعلیم میں غیر ملکی امداد سے تبدیلی کرنا، ہائر سیکنڈری سکولوں میں آرٹس مضامین کے اساتذہ کی بھرتی پر پابندی لگانا۔۔۔کیا آئین کی خلاف ورزی اور ریاست وآئین سے غداری نہیں؟

ان دلائل وحقائق کی بنا پر راقم چیف الیکشن کمشنر، چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اور چیف جسٹس آف پاکستان سے ملتمس ہے کہ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب کو اپنی آئینی حدود سے تجاوز کرنے، غیر ممالک کی مداخلت قبول کرنے، تعلیمی اداروں کے ماحول کو مادر پدر آزاد بنانے اور نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی پاداش میں جن سے پوری نسل نا مسلمان اور ذہنی مریض بن جائے، نہ صرف انتخابات میں حصہ لینے سے نااہل قرار دیا جائے بلکہ ان کو آئین و قانون کے مطابق سزا بھی دی جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دینی مدارس کا نظام تعلیم

مولانا مفتی محمد اصغر ☆

☆ مدرس جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد

دینی مدارس کے فضلاء کی خدمت میں
چند گزارشات

مدارس دینیہ کا تعلیمی سال شوال المکرم سے شروع ہوتا ہے اور شعبان المعظم پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں طلبہ حصول تعلیم کے لے دینی مدارس کا رخ کرتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق علوم دینیہ سے اپنے سینوں کو سیراب کرتے ہیں۔ درس نظامی کا دورانیہ آٹھ برسوں پر محیط ہے اور یہ آٹھ برس ایسے گزرتے ہیں کہ ان کے گزرنے کا طالب علم کو احساس ہی نہیں ہوتا۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ درس نظامی پڑھنے کے لیے اولیٰ میں داخلہ لیا تھا اور اب ماشاءاللہ دورہ حدیث مکمل کر کے فارغ التحصیل ہو رہے ہیں اا ور اپنے اساتذہ اور اکابر حضرات کے دست ہائے شفقت سے دستار فضیلت حاصل کر رہے ہیں۔ گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی مدارس کے تعلیمی سال کا اختتام قریب ہے۔ اس موقع پر ختم بخاری شریف کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں اور ان تقریبات سے مدارس کی رونق دو بالا ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کو اپنے اکابر اساتذہ سے دستار فضیلت حاصل کرنے اور اپنے تعلیمی دورانیہ کے بخیر وخوبی مکمل ہونے اور اپنے والدین اور اساتذہ کی دعاؤں کا ثمر ملنے پر بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام فارغ التحصیل ہونے والے علماء کو یہ خوشی مبارک کرے، ان کو باعمل عالم بنائے اور امت مسلمہ کو ان کے علوم سے مستفید فرمائے۔

البتہ ان فارغ التحصیل ہونے والے علماء کرام کو اس موقع پر جہاں اتنی خوشیاں نصیب ہوتی ہیں ، وہیں ان کو اپنے مستقبل کے بارے میں بہت سے اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں کہ اب عملی زندگی میں قدم رکھنے کا وقت آ گیا ہے تو کیا کیا جائے؟ عملی زندگی کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ دین کے کس شعبے کو اپنی عملی زندگی کی جولان گاہ بنایا جائے؟ اس سلسلے میں کچھ حضرات تو دوران تعلیم ہی اپنے مستقبل کے بارے میں اپنے ذوق و مزاج کے مطابق منصوبہ بندی کر لیتے ہیں۔ اپنے والدین اور اساتذہ کرام کے مشوروں کی روشنی میں دین کا کوئی خاص شعبہ اور ایک خاص طریقہ متعین کر لیتے ہیں اور اس کے متعلق سوچ و بچار اور غور فکر کرتے رہتے ہیں اور پھر فارغ ہونے کے بعد اسی شعبہ میں کار ہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔

لیکن ایک معتد بہ تعداد ایسے حضرات کی بھی ہوتی ہے جن کو دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ اب عملی زندگی میں قدم رکھنے کا وقت آ گیا ہے اور حضرات اساتذہ کرام نے ہمارے سروں پر دستار فضیلت رکھ کر ایک بھاری ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ تو اب ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی ہماری راہنمائی کرے اور ہمیں ہمارے مستقبل کے بارے میں بہتر سے بہتر راہ متعین کر کے دے جس سے ہمارے دین و دنیا کو فائدہ پہنچے اور ہماری آخرت بھی سنور جائے۔

ان حضرات کے ذہنوں میں کبھی ایک خیال آتا ہے تو کبھی دوسرا۔ کبھی ایک راہ متعین کرتے ہیں کبھی دوسری۔ یہ حضرات بالکل ایک ایسے دوراہے بلکہ چوراہے پہ کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے کئی راستے بالکل مختلف سمتوں کو نکلتے ہیں اور مسافر ایسے موقع پر مختلف اندیشوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور مختلف خیالات اس کو گھیر لیتے ہیں۔ کبھی حصول مقصد کے لیے ایک راستہ منتخب کرتا ہے تو کبھی دوسرا۔ کبھی ایک سمت کو روانہ ہوتا ہے تو کبھی دوسری سمت کو۔ اس وقت مسافر کو ایک بہتر گائیڈ کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس سے منزل کا پتہ معلوم کر کے چلا جائے اور بغیر کسی خوف وخطر کے خیالات و اندیشوں میں الجھے اپنی منزل کو پالیا جائے۔ بعینہ نئے فارغ ہونے والے علماء حضرات کی کم وبیش یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر بہترین راہنمائی تو اللہ تعالی سے دعا اور استخارہ ہے اور پھر اپنے والدین و اساتذہ کرام سے مشورہ ہے، جن کے سامنے اولیٰ سے لے کر دورۂ حدیث تک آٹھ سال کا طویل عرصہ گزارا ہوتا ہے اور فارغ ہونے والوں کی علمی قابلیت اور استعداد سے وہ بخوبی آگاہ ہوتے ہیں اور کسی حد تک مزاج و مذاق سے بھی واقف ہوتے ہیں، ان سے اپنے مستقبل کی راہ متعین کرائی جائے۔ بندہ بھی اسی راہ کا مسافر ہے اور اسی راہ کو نجات کو ذریعہ اور قابل فخر سمجھتا ہے اور کم وبیش انہی کیفیات و حالات سے گزرا ہے جن کا سطور بالا میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ الحمد للہ، بندہ کا دوران طالب علمی اس دعا کا معمول رہا ہے کہ ''یا اللہ اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرما'' اور پھر فارغ ہونے کے بعد اپنے اساتذہ کرام کے مشورہ سے خدمت دین کی یہی لائن منتخب کی ہے۔ اب استقامت کی دعا کرتا ہے اور آپ حضرات سے بھی اس دعاء کا متمنی ہے۔ اللہ تعالی قبول فرمائے (آمین)۔

ایسے موقع پر حضرات اساتذہ کرام اپنے تجربات کی روشنی میں اپنے مزاج و مذاق کے مطابق طالب علم کی استعداد اور اس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اور وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مفید ہدایات دیتے ہیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں اپنے لیے کوئی راہ متعین کی جاسکتی ہے اور انفرادی طور پر اپنے اساتذہ کرام سے بھی مشورہ کیا جاسکتا ہے۔

نئے فارغ ہونے والے کچھ حضرات تو ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے تعلیم کو آگے جاری رکھنا نہیں ہوتا وہ اپنی استعداد و مزاج کے مطابق اساتذہ کے مشورے اور دعاؤں سے شعبہ کتب کی تدریس یا شعبہ حفظ قرآن کریم کی تدریس اختیار کر سکتے ہیں یا امامت وخطابت کا شعبہ یا دعوت وتبلیغ کا شعبہ اختیار کر سکتے ہیں، یا سرکاری تعلیمی شعبوں یا دیگر شعبہ جات کو حسب استعداد ومزاج اختیار کر سکتے ہیں۔ اپنے لیے جس شعبہ کو بھی اختیار کیا جائے نیت رضائے الٰہی اور خدمت دین کی ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی راہیں کھولتے ہیں، اس کے اسباب پیدا کرتے ہیں اور پھر کامیابیوں سے سرفراز بھی کرتے ہیں۔

اور کچھ حضرات ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے آگے تعلیم کو جاری رکھنا ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض تو عصری تعلیم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں اور اس میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں اور مغربی تہذیب وماحول میں رہ کر اپنے دینی وعلمی تراث سے محروم ہو جاتے ہیں اور تقویٰ وروحانیت سے کوسوں دور چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی دستگیری فرمائے (آمین)۔ ایسے حضرات کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے اور دینی علوم کے مختلف شعبہ جات میں سے کسی ایک میں بھی تخصص وترقی کا راستہ کھولنا چاہیے۔ چونکہ ہمارا دور تخصصات کا دور سمجھا جاتا ہے اور ہر فن میں ہر ایک کے لیے کامل مہارت حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے جس شعبہ سے مزاج جڑتا ہو اس شعبہ میں تخصص کر کے عملی زندگی کا سفر آسان بنایا جا سکتا ہے۔ مستقبل کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں چند مفید شعبہ جات کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے:

تخصص فی علوم القرآن

مدارس میں اگرچہ تفسیر وعلوم قرآن کا مضمون داخل نصاب ہے اور ترجمہ وتفسیرِ قرآن کئی سالوں میں پڑھایا جاتا ہے اور یہ بہت بابرکت سلسلہ ہے جو نہ صرف جاری رہنا چاہیے بلکہ اس میں مزید ترقی کرنی چاہیے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس سے علوم قرآن کا حق ادا نہیں ہوتا۔ تفسیر کے مہتم بالشان مسائل، مفسرین کے مناہج، تاریخ تدوین قرآن اور خاص طور پر دور جدید میں قرآن کریم پر کیے جانے والے اعتراضات وشبہات اور ان جیسے مہمات مسائل سے طلبہ کی اکثریت ناواقف رہتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ ''آج قرآن پر از سرنو اعتراضات اور شبہات کی لہریں زور وشور سے مشرق و مغرب میں پھیل رہی ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر وتشریح کے بارے میں طرح طرح کے شبہات عقلی وعلمی انداز میں مشرق ومغرب میں اٹھائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے ان روز افزوں اعتراضات اور شبہات کا مدلل اور سنجیدہ جواب دینے کے لیے جس طرح کے متخصص اہل علم درکار ہیں وہ ناپید ہیں۔

یہاں تک کہ خود مسلمانوں کے اعلی تعلیمی اداروں میں یہ نئے گمراہ کن اسالیب جگہ پا رہے ہیں اور مسلمان طلبہ کے ذہنوں کو پراگندہ اور پریشان کررہے ہیں''۔اس شعبے کو اپنانے اور اس میں قابلیت پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

تخصص فی الحدیث

خدمت حدیث کے حوالے سے مدارس دینیہ میں الحمدللہ بہت مفید اور عمدہ کام ہو رہا ہے اور درس نظامی کا آخری سال تو حدیث ہی کے لیے وقف ہے۔صحاح ستہ سمیت احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ طلبہ کے سامنے آجاتا ہے۔حدیث اور علوم حدیث سے اچھی خاصی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی علم حدیث کے وسیع ذخائر اور لامتناہی معارف و دفاتر اور عمیق مباحث نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔اس لیے اس شعبے کو بھی کما حقہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تخصص فی الفقہ و اصول الفقہ

فقہ میں تخصص کا رجحان مدارس کے طلبہ میں زیادہ پایا جاتا ہے اور بہت سارے مدارس اس کا عملاً انتظام بھی کرتے ہیں لیکن اس میں بھی زیادہ تر روایتی طرز کا کام ہو رہا ہے جو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہو رہا۔اگرچہ بعض جگہ بہت ٹھوس اور مفید علمی کام بھی ہو رہا ہے۔اس شعبے میں بھی قابلیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

تخصص فی علوم القرآن

جس طرح قرآن کریم کے معانی و مفاہیم کا جاننا ضروری ہے اسی طرح الفاظ و نظم قرآنی سے متعلقہ علوم کا جاننا بھی ضروری ہے۔علم تجوید،علم رسم قرآنی،علم قرأت،فواصل، اوقاف وغیرہ کا جاننا بھی اہم ہے۔یہ شعبہ تنزلی کا شکار ہے۔نئے فارغ ہونے والے قراء وعلماء اس شعبہ کے احیاء کی طرف متوجہ ہوں تو براہ راست اللہ تعالی کے کلام قرآن پاک کی خدمت بھی ہوگی اور اس پر ملنے ولا اجر وثواب بھی زیادہ ہوگا۔

تخصص فی الدعوۃ و الارشاد

عصر حاضر میں دعوت وتبلیغ کے شعبے کو از سر نو منظم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔دعوت وتبلیغ کے نئے اسالیب دور جدید کے تقاضوں کے مطابق اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ جدید ذہن کے لوگوں کو قرآن کریم کے احکام سے مطمئن کیا جاسکے اور ان کی زبان اور ان کے محاورے استعمال کر کے حکمت و

مصلحت کے ساتھ معاشرے کی دینی تشکیل کی جا سکے۔ رائے عامہ کی اسلامی تربیت میں آئمہ اور خطباء کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہ تب ہی ہو سکتی ہے جب خود آئمہ وخطباء کی تربیت صحیح نہج پر کی گئی ہو۔

تخصص فی علم الکلام

علم کلام کا مسئلہ دنیا کے ہر مذہب کی تاریخ میں ایک نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ایک ایسا نظام عقائد اور ایمانیات جس میں اس مذہب کے بنیادی تصورات موجود ہوں، ایک اہم عنصر کے طور پر رہا ہے۔ اسلام چونکہ ایک برحق دین ہے اس لیے اس کا بھی ایک نظام عقائد موجود ہے جسے علم کلام کہتے ہیں۔ علم کلام ایک خالص اسلامی علم ہے جس کی اساس قرآن وسنت پر ہے۔ باقی مذاہب کے عقائد ونظریات سے الگ اسلام کا اپنا نظریہ عقائد ہے۔ قدیم علم کلام کو جدید علم کلام سے ہم آہنگ کرنے اور اس کی ترتیب وتدوین کی ضرورت ہے۔ یہ شعبہ بھی نئے فضلاء کی توجہ کا متقاضی ہے۔

تخصص فی اللغة العربیہ و الانجلیزیہ

پوری دنیا عہد حاضر میں ایک گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مختلف اقوام کے ساتھ رابطے کے لیے انگریزی زبان ایک خاص اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ انگریزی زبان تقریباً ہر ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یورپی ممالک میں رہنے والے لوگوں کو اسلام کی دعوت اور اسلامی احکام پہنچانے کے لیے انگریزی زبان ایک بہترین واسطہ ہے۔ مغربی ممالک کے باشندوں کو انہی کی زبان اور انہی کے لہجہ ومحاورے میں اسلام کی دعوت پہنچانے کی اشد ضرورت ہے اس لیے اس نقطۂ نظر سے انگریزی زبان سیکھنے اور بولنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ دین کی خدمت ہوگی۔

عربی زبان تو الحمدللہ ہمارے دین کی زبان ہے۔ قرآن کریم احادیث مبارکہ اور اسلامی علوم کا بہت سا لٹریچر عربی زبان میں ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان بھی عربی ہے اور اہل جنت کی زبان بھی عربی ہے اور ہماری عبادت کی زبان بھی عربی ہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے سیکھنے اور اپنانے کی ضرورت ایک اور سبب سے بھی ہے جسے علامہ زاہد الراشدی صاحب نے بایں الفاظ ذکر کیا ہے ''قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے اصل حالت میں محفوظ رہنے کے ظاہری اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے لئے تراجم پر انحصار کرنے کی بجائے اصل زبان میں ان کی تعلیم وتدریس کو ضروری قرار دیا گیا ہے جبکہ تورات، زبور اور انجیل کے محفوظ نہ رہنے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ اصلی زبان اور اس میں ان کتابوں کے متن محفوظ نہ رہ سکے جس کی وجہ سے

تراجم پر انحصار کرنا پڑا۔ پھر ترجمہ در ترجمہ کے مسلسل عمل نے اصل کتابوں کو باقی نہ رہنے دیا۔ اسی وجہ سے ہمارے فقہاء کرام نے عربی متن کے بغیر قرآن کریم کے کسی بھی زبان میں خالی ترجمہ کی اشاعت وطباعت کو ممنوع قرار دے رکھا ہے کہ صرف ترجمہ کی اشاعت سے تحریف کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور اگر عربی متن ساتھ ہو تو کوئی بھی تحریف کسی بھی وقت چیک ہوسکتی ہے۔''

اور پھر عربی زبان دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور بہت سارے ملکوں کی قومی زبان ہے اور دنیا کے تقریباً ہر حصے اور خطے میں بولی لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ ان لوگوں تک اسلام کی موثر دعوت پہنچانے کے لیے اور اسلام کی نمائندگی کے لیے عربی زبان کے سیکھنے کی اہمیت مزید دو چند ہوجاتی ہے۔

دور حاضر میں جدید عربی زبان میں تکلم، پڑھنے، لکھنے، سیکھنے اور سمجھنے کی اہمیت کیا ہے؟ اس میدان میں طویل عملی تجربہ رکھنے والے مفتی ابولبابہ مدظلہ کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''اس وقت اہل علم اگر دو کام کرلیں ایک مدارس میں اور ایک عوام میں، تو ایک طرف تو ان کی اپنی علمی واصلاحی حالت بہت بہتر ہوسکتی ہے۔ دوسری طرف معاشرے میں ان کا نفوذ، ان کا اعتبار اور ان کی خدمات ان شاء اللہ بہت مؤثر ہوسکتی ہیں۔ مدرس میں فصیح عربی کے تکلم وانشاء اور حفظ الحدیث کو فروغ دیا جائے اور عوام میں درس قرآن وحدیث اور مستند فقہی مسائل کی تعلیم کو رواج دیا جائے۔ اہل علم ان دو محنتوں کے مضمرات ونتائج پر غور کریں تو انہیں احساس ہوگا کہ انشاءاللہ اس سے دونوں مقاصد بطریق احسن حاصل ہوجائیں گے۔''

تخصص فی التاریخ الاسلامی

قوموں کا روشن مستقبل ماضی کے حوادث وواقعات سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک انسان جس طرح روح وجسم کے باہمی ربط سے زندہ ہے اسی طرح قوموں کی زندگی کا دارومدار بھی تاریخی روایات کو زندہ رکھنے پر ہے۔ جو قوم اپنی تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتی وہ اس دنیا میں ایک زندہ قوم بن کر نہیں رہ سکتی۔ ماضی سے اچھی طرح آشنائی کے بغیر مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے فضلاء کرام کے لیے اپنے اسلامی ورثہ سے مربوط رہنا اور اپنی اسلامی تاریخ سے وابستہ رہنا بھی ضروری ہے اور اس میں بھی کمال حاصل کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ چند ماہ قبل لاہور ہائیکورٹ کے ایک وکیل سے ملاقات ہوئی۔ دوران ملاقات اس نے اپنے تعلیمی پس منظر سے آگاہ کیا اور اپنے پیشہ وارانہ کام کے سلسلہ میں مجھ سے تبادلہ خیال کیا اور مختلف تاریخی واقعات وحالات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش

کیا اور تاریخ اسلام کے چند اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں بھی اس کے نتائج فکر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں ۔ چنانچہ اثنائے گفتگو اس نے دینی مدارس کے کردار اور ان کی تاریخ ،ارتقاء اور نظام و نصاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے برملا اس بات کا اعتراف کیا کہ ہمارے سکول و کالج اور یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں دینی علوم خاص طور پر تفسیر ،حدیث ،فقہ اور اسلامی تاریخ پر صحیح معلومات کا فقدان ہے۔

تاریخ اسلامی کے چند بڑے بڑے واقعات پر مستند صحیح معلومات نصابی کتب میں فراہم نہیں کی گئیں ۔تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد جب مجھے قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی تاریخ کے چند اہم واقعات پر مستند اسلامی تاریخی کتب پڑھانے کا موقع ملا تو اصل حقیقت منکشف ہوئی اور ان واقعات کے بارے میں دوران تعلیم نصابی کتب کے حوالے سے جو ذہن بن گیا تھا یا بنا دیا گیا تھا وہ یکسر بدل گیا ۔ پہلے ہمارے ذہنوں میں بٹھایا گیا تھا کہ تاریخ صرف حقیقت شناسی کا نام ہے۔اس میں اسلامی طرز فکر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان کو عقل و شعور ،سائنسی تجربات اور حسی مشاہدے کی بناء پر کسی بھی واقعہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ مذہب اور اسلامی طرز فکر کے ساتھ تاریخ کو دیکھنا پرکھنا تو تنگ نظری کی علامت ہے کھلے دل و دماغ کے ساتھ مذہب اور عقیدے کی پابندی کے بغیر تاریخی واقعات کو دیکھنا چاہیے۔اس پر میں نے عرض کیا کہ یہ ذہنیت درحقیقت مغربی محققین اور مستشرقین کی طرف سے درآمد کی گئی ہے ۔مغربی محققین دراصل خود مذہب بیزار ہیں اور یہ طرز فکر اپنے ذرائع سے دنیا بھر میں عام کر رہے ہیں۔خاص طور پر میڈیا کے ذریعہ سے یہ ذہنیت عام لوگوں میں بڑی تیزی سے منتقل کر رہے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص ان کا ہدف ہے اور وہ اس طرز فکر سے جلد متاثر ہو جاتا ہے اور ان کا ہم خیال بن جاتا ہے لیکن یہ طرز فکر روایۃً اور درایۃً غلط ہے اور معروضی حالات سے بھی نا آشنائی پر مبنی ہے۔عقیدے اور مذہب کے بغیر تاریخ اور تحقیق گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں مجھے یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ خود دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی اسلامی تاریخ کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے طلبہ اس سے کتنی واقفیت رکھتے ہیں؟ یہ بات کوئی راز نہیں ،ہم سب کو معلوم ہے۔اس لے ارباب مدارس کے حل وعقد کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں اسلامی تاریخ کو بطور نصاب کے سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور اسے اتنی اہمیت دی جائے جتنا اس کا حق بنتا ہے۔ ماضی سے اچھی طرح آشنائی کے بغیر مستقبل کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے اور نہ ہی حال کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے ہر زندہ قوم اپنے تاریخی ورثے سے مربوط رہتی ہے اپنی سابقہ روایات کا تسلسل برقرار رکھتی ہے اور اس پر کسی سے

کمپرومائز نہیں کرتی۔قوموں کے عروج وزوال کا اصول بھی ماضی کی تاریخ سے معلوم ہوسکتا ہے اوران کی ذہنی نشوونما اور صحیح تربیت بھی تاریخ سے آشنائی پر مبنی ہے۔تاریخ کے مطالعہ سے انسان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور ہمت جوان ہوتی ہے۔دانائی اور بصیرت ترقی کرتی ہے،دل سے رنج وغم اور خوف کے سائے چھٹتے ہیں اور مسرت اور خوشی سے دل لبریز ہوتا ہے۔دوراندیشی میں اضافہ اور قوت فیصلہ بڑھ جاتی ہے۔صبر واستقلال کا مادہ پیدا ہوتا ہے،دل ودماغ میں ہروقت تازگی موجود رہتی ہے۔جس سے دل ودماغ میں ایک بابرکت جوش پیدا ہوتا ہے اور نیکی کے جذبات بڑھتے ہیں۔سابقہ اقوام عالم سے سرزد ہونے والی دانستہ یا نادانستہ غلطیوں سے درس عبرت حاصل ہوتا ہے۔اس لیے مدارس کے طلبہ وفضلاء کرام کے لیے دور حاضر میں تاریخ سے آشنائی کی اہمیت مزید دوچند ہوجاتی ہے۔خاص طور پر دور نبوی ﷺ سے کامل واقفیت ،دور خلافت راشدہ،بنوامیہ،بنوعباس اور سلاطین اسلام کے ادوار کی ترتیب وار مکمل تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔

تخصص شعبۂ صحافت

ہر زمانے میں جنگوں کا معیار جدا جدا رہا ہے۔دور حاضر کی جنگیں اسلحہ اور جنگوں کے آلات سے نہیں لڑی جارہیں بلکہ قلم اور میڈیا کے ذریعے لڑی جارہی ہیں۔اس دور کا جنگی ہتھیار قلم اور میڈیا ہے۔علامہ زاہدالراشدی مدظلہ کے الفاظ میں اس پر بہتر روشنی ڈالی گئی ہے:

''اسلام کی دعوت ،اس کے دفاع اور اسلامی عقائد واحکام کے خلاف مغربی دنیا کے بڑھتے ہوئے ثقافتی حملے اور یلغار کے مقابلہ میں اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف عربی بلکہ اردو اور انگلش میں بھی صحافتی زبان اور اسلوب سے آگاہ ہوں اور پورے اعتماد کے ساتھ اس میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی مہارت اور ذوق رکھتے ہوں۔اس کے بغیر ہم آج کے دور میں نہ اسلام کی دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری ادا کرسکتے ہیں اور نہ ہی ہم مغربی ثقافت کی ہمہ جہت یلغار کی اس فضا میں اسلامی تعلیمات کے تحفظ اور دفاع سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں''

اس لیے یہ شعبہ بھی فضلاء کی توجہ کا متقاضی ہے۔اسی طرح اسلامی معیشت وتجارت ،تقابل ادیان،افتاء اور قضاء،فکر جدید اور مغربی تہذیب وثقافت کا مطالعہ اور اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کا عصر حاضر کے تناظر میں مطالعہ جیسے بہت سارے موضوعات ہیں جن کا فضلاء کرام کے لیے جاننا ضروری ہے۔فضلاء کرام اس طرح کے موضوعات میں مہارت حاصل کرکے دین کی بہترین خدمت اور امت

مسلمہ کی بہترین رہنمائی بھی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالی ہم سب کو اخلاص نیت کے ساتھ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

تفہیم دین ملی مجلس شرعی

توہینِ رسالت کی آڑ میں بربریت

ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام ایک علمی مذاکرہ

ملی مجلس شرعی تمام دینی مکاتب فکر کا ایک متحدہ پلیٹ فارم ہے جس میں ثقہ اور معتدل مزاج علماء کرام شامل ہیں اور جہاں معاشرے کو درپیش متنوع مسائل میں سب مسالک کی طرف سے متفقہ مؤقف پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ توہینِ رسالت کے حوالے سے ملک میں عوامی سطح پر قانون ہاتھ میں لینے کے جو متعدد واقعات ہوئے ہیں اور خصوصاً حال ہی میں لاہور بادامی باغ میں جس بربریت سے عیسائی آبادی کو جلا دینے کا واقعہ پیش آیا ہے، اس کے پیشِ نظر ملی مجلس شرعی نے علماء کرام کا ایک اجلاس 13 مارچ 2013ء کو بلایا جس میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت مجلس کے صدر مولانا مفتی محمد خاں قادری صاحب نے کی جب کہ نقابت کے فرائض مجلس کے جنرل سیکرٹری مولانا ڈاکٹر محمد امین نے ادا کیے۔ اس مذاکرے کی روداد قارئین کی خدمت میں پیش ہے:

ڈاکٹر محمد امین

ہمیں دو باتوں پر غور کرنا ہے ایک تو یہ کہ توہین رسالت (اور توہین قرآن) کے نام پر قانون ہاتھ میں لینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اور جس کی وجہ سے قیمتی جانوں اور املاک کا ضیاع ہو رہا ہے، ملک کی بدنامی بھی ہو رہی ہے اور معاشرے میں رواداری اور فکری انتشار میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہے اس کے اسباب کیا ہیں اور جب ہم اسباب کا تعین کر لیں تو پھر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ان کا تدارک کیسے ممکن ہے اور اس طرح کے واقعات کو روکنے کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔

علامہ خلیل الرحمان قادری

میرا خیال ہے کہ اس صوت حال کے چار بڑے سبب ہیں :ایک عوام کی جذباتیت وحساسیت، دوسرے علماء کرام کی مسلک پرستی، تیسرے ذاتی اور مخصوص مفادات کا حصول اور چوتھے بعض غیر ملکی اور مقامی خفیہ ایجنسیوں کا کردار۔ یہ عوامل اور اسباب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ

ہم ایک ایک کر کے ان پر غور کریں تا کہ باتیں آپس میں گڈ مڈ نہ ہوں۔لہذا سب سے پہلے اس موضوع پر گفتگو کر لی جائے کہ عوام کی جذباتیت کا سبب کیا ہے اور وہ کیوں مشتعل ہوتے ہیں؟

مفتی محمد خان قادری

عوام کو یہ جاننا چاہیے کہ بلاشبہ توہینِ رسالت ایک انتہائی سنگین اور جذباتی معاملہ ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جب قانون میں گستاخی کی سزا موت موجود ہے تو پھر لوگوں کو قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے بلکہ قانون کو اپنا راستہ چلنے دینا چاہیے تا کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا ملے اور پولیس اور عدالتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے اقدامات کریں کہ اس طرح کے معاملات کا جلد سے جلد فیصلہ کیا جائے تا کہ عوام میں یہ تاثر اور مایوسی پیدا نہ ہو کہ حکومت نے تو کچھ کرنا نہیں خود ہی جو کرنا ہے کر لو۔

مولانا زاہد الراشدی

مسجدیں بھی عوام کو اشتعال دلانے میں استعمال ہوتی ہیں۔علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کے معاملے میں تحمل اور رواداری سے کام لیں اور بغیر تحقیق کے مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے کوئی غیر مناسب اعلان نہ کریں اور نہ ہی کسی دوسرے کو ایسا اشتعال انگیز اعلان کرنے دیں جس سے عوام میں اضطراب اور اشتعال پھیلے۔بلکہ اس کے برعکس اگر علماء کرام کا کردار مومنانہ فراست پر مبنی ہو تو وہ خطبات جمعہ میں لوگوں کی دینی تربیت کر سکتے ہیں کہ ایسے مواقع پر مشتعل نہ ہوا جائے اور یہ کہ بلاشبہ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جزو ایمان ہے لیکن اس کا ہرگز یہ تقاضا نہیں کہ مجرم کا جرم ثابت ہوئے بغیر اس کے اعزہ واقرباء یا ہم مذہبوں کو قتل کر دیا جائے یا اس کے گھر اور گاؤں کو آگ لگا دی جائے۔

مولانا امیر حمزہ

میں کہتا ہوں کہ غیر مسلم تو رہے ایک طرف، خود مسلمانوں کے اندر معاملات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہر مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کو جزو ایمان سمجھتا ہے لہذا کوئی کلمہ گو مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔اس کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ادب کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور کوئی بات ایسے اسلوب اور انداز میں نہیں کہنی چاہیے جس سے سوئے ادب کا پہلو نکلتا ہو۔دوسری طرف اختلاف مسلک کی بنیاد پر کسی مسلمان کو کافر اور مشرک نہیں کہنا چاہیے کیونکہ کوئی مسلمان توحید کی اہمیت کا منکر نہیں ہو سکتا اور نہ اللہ کے ساتھ کسی نبی یا ولی کو شریک کرتا ہے اور نہ کوئی ایسی بات کہتا ہے جس کی وہ مناسب تاویل نہ کرتا ہو لہذا اگر سارے مسالک طے کر لیں کہ کسی مسلمان اور کلمہ گو کو کافر، مشرک اور گستاخِ رسول نہیں کہیں گے تو جذباتی فضا پیدا نہیں ہو گی۔

حافظ حسن مدنی

ہمیں جرأت کر کے زمینی حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے اور یہ مان لینا چاہیے کہ ہمارے ہاں دینی عناصر کی حالت یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے اپنے مسلک کو دین بنا یا ہوا ہے حالانکہ مسلک تو محض ایک اجتہادی مکتب فکر اور دینی موقف ہوتا ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی جب کہ دین کی بنیاد قرآن وسنت ہے جو ہمارے دین کے بنیادی مآخذ ہیں اور جو غلط نہیں ہو سکتے۔اس لیے کسی مسلمان کو خواہ وہ عالم ہو یا عامی،اپنے مذہبی مسلک یا اجتہادی موقف کے لیے وہ حمیت اور عصبیت نہیں رکھنی چاہیے جو کہ دراصل دین کے لیے مخصوص ہے۔

ڈاکٹر محمد امین

فرقہ واریت یعنی مسلکی تعصب کے کئی اسباب ہیں ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم نے اپنی مسجدیں،مدرسے،ادارے حتی کہ سیاسی جماعتیں بھی اپنے اپنے مذہبی مسلک پر بنا رکھی ہیں حالانکہ علماء کرام اگر چاہیں تو مل بیٹھ کر اس لہر کو کم کر سکتے ہیں اور اس کے لیے متعدد اقدامات کئے جا سکتے ہیں خصوصاً دینی مدارس اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

دینی مدارس کو چاہیے کہ وہ اپنا نصاب اور طریق تدریس بدلیں،دوسرے مسالک کے مصنفین کی کتابیں بھی داخل نصاب کی جائیں،علمی مسائل میں بین المذاہب تقابلی مطالعے کو رواج دیا جائے اور پڑھاتے وقت اختلافی مسائل کو نہ اچھالا اور ابھارا جائے۔دینی مدارس یہ پابندی بھی ختم کر سکتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبہ کا تعلق لازماً ایک ہی مسلک سے ہو۔مسجدوں کو بھی فرقوں کا گڑھ بنانے کی بجائے بیوت اللہ یعنی اللہ کا گھر قرار دیا جائے جس میں ہر مسلک اور مکتب فکر کے مسلمانوں کو نماز ادا کرنے کی اجازت ہو۔اسی طرح دینی سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعت بنانے کی بجائے اسے سارے مسالک کے لیے اوپن کریں اور دینی اور سیاسی منشور اور پروگرام کی بنیاد پر جماعت بنائیں بلکہ نفاذ شریعت کی بنیاد پر متحد ہو جائیں اور ایک پروگرام پر جمع ہو جائیں۔علماء کرام اگر یہ اقدامات کریں تو یقیناً اس سے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوگی اور اتحاد امت بلکہ صحیح تر لفظوں میں''اتحاد بین المسالک''اور''اتحاد بین العلماء''کو فروغ ملے گا۔

ہماری رائے میں حکومت بھی فرقہ واریت کو بڑھاتی ہے۔آپ کوئی مسجد یا مدرسہ نہیں بنا سکتے جب تک درخواست میں اپنا مسلک نہ لکھیں حکومت نے ہر مسلک کا الگ الگ تعلیمی بورڈ منظور کر رکھا ہے اور وزارت اوقاف میں ہر مسلک کا خطیب مقرر کر رکھا ہے۔اسٹیبلیشمنٹ دراصل چاہتی ہے کہ دینی قوتیں آپس میں لڑتی

رہیں، ان کے ووٹ تقسیم ہو جائیں اور سیکولر سیاسی جماعتیں آرام سے حکومت کرتی رہیں۔ دینی قوتوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے اور بڑھانے میں بین الاقوامی اور مقامی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے یہ ہماری دینی قیادت کی فراست کا امتحان ہے کہ علماء کرام ان فتنوں کا ادراک کرتے ہوئے متحد ہو جائیں اور قوم کو بھی متحد کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کے درمیان مشترکات اتنے زیادہ ہیں کہ فروعی اختلافات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

جہاں تک قانون توہین رسالت کے غلط استعمال کا تعلق ہے تو اگرچہ دنیا کے ہر قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے اور اس کے لیے سزا بھی مقرر ہوتی ہے چنانچہ تعزیراتِ پاکستان میں بھی قانون کے غلط استعمال کی سزا موجود ہے یہاں تک کہ اگر کسی کی جعلی کوششوں سے کسی شخص کو سزائے موت ہو جائے تو اسے بھی سزائے موت دی جاسکتی ہے۔ بہر حال پھر بھی قانون توہین رسالت چونکہ ایک حساس قانون ہے اس لیے اس کے غلط استعمال سے بچنے کے لیے میری چند تجاویز ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوں ہی کسی پر الزام لگے، اسے فوراً رپورٹ درج کر کے پولیس اپنی حراست میں لے لے تاکہ عوام میں اشتعال نہ پھیلے۔ جہاں تک ایف آئی آر کا تعلق ہے تو میری تجویز یہ ہے کہ ضلعی سطح پر ایک بورڈ بنایا جائے جس میں سارے مسالک کے جید علماء کرام شامل ہوں (اور اگر ملزم غیر مذہب کا ہو [مثلاً عیسائی ہو یا ہندو ہو] تو اس مذہب کا نمائندہ مذہبی رہنما بھی اس بورڈ کا ممبر ہوگا) اور وہ ابتدائی تحقیق کر کے یہ طے کریں کہ توہین رسالت یا توہین قانون کا کوئی واقعہ ہوا بھی ہے یا نہیں۔ اگر کوئی غلط فہمی ہو تو وہ رفع دفع کرا دیں اور اگر الزام میں وزن ہو تو FIR کٹوا دیں اور پھر عدالتوں کو بھی چاہیے کہ ایسے کیسز کا جلد سے جلد فیصلہ سنائیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ فیصلے میں تاخیر سے لوگوں میں مایوسی پھیلتی ہے اور وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اپنے زعم میں خود انصاف کر لیتے ہیں۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ اس کی مدت مقرر کر دی جائے مثلاً تین ماہ کے اندر اس کا فیصلہ سنا دیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر شہر میں وکلاء کا ایک پینل بنا دیا جائے جو اس طرح کے کیسز پر کام کرے اور اسے سست روی کا شکار نہ ہونے دے۔

علامہ خلیل الرحمٰن قادری

یہ تجاویز بہت اچھی ہیں اور ان پر عمل درآمد ہونا چاہیے اور یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قانون پر مؤثر عمل درآمد اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں عوام مایوس ہو کر قانون ہاتھ میں لے لیتے ہیں جیسا کہ پہلے گوجرہ میں واقعہ ہوا تھا یا اب بادامی باغ میں ہوا ہے۔ اس طرح کی صورت حال

میں غیر ملکی قوتوں کو موقع مل جاتا ہے کہ پاکستان کو بدنام کریں، مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیں اور قانون توہینِ رسالت کے خلاف پروپیگنڈا کریں اور اس کے خاتمے کی مہم چلائیں لہذا اندرون ملک خلفشار و بے چینی اور اسلام دشمن بیرونی سازشوں کو پنپنے کا موقع نہ دینے کا یہی طریقہ ہے کہ اس طرح کے کیسوں کا جلد فیصلہ کیا جائے کیونکہ مجرموں کو سزا نہ دینے یا اس میں تاخیر سے عوام میں اشتعال پھیلتا ہے۔

مولانا زاہد الراشدی

ہمارا گوجرانوالہ کا تجربہ یہ ہے کہ ایسے ہی ایک موقع پر ہم نے عیسائی پادریوں کو اعتماد میں لیا اور مسئلہ حل کر لیا لہذا ایسے مواقع پر مختلف مذاہب یا مسالک کے ثقہ اور معتدل مزاج علماء کو فوراً باہمی رابطہ کر لینا چاہیے اور حالات کے بگڑنے اور حکومتی مداخلت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

مولانا امیر حمزہ

ایسے کئی واقعات میرے ذاتی علم میں ہیں اور اخبارات میں آچکے ہیں جن میں بعض لوگوں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر لوگوں کو توہین رسالت یا توہین قرآن کے نام پر مشتعل کیا اور جان و مال واملاک کے ضیاع کا سبب بنے لیکن ہمارا نظام انصاف اتنا لنگڑا لولھا، سست اور تکلیف دہ ہے کہ مظلوم اس کے ذریعے ظالم سے بدلہ لینے کا نہیں سوچتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ قانون کا غلط استعمال کرنے والے کو سزا نہیں ملتی۔ حکومت بھی اس سلسلے میں سستی کرتی ہے اور قانون ہاتھ میں لینے والوں کو سزا نہیں دیتی نتیجہ یہ ہے کہ مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اگر حکومت اس طرح کے معاملات میں ترجیحاً جلد فیصلہ آنے کے لیے اقدامات کرے اور جو لوگ قانون کا غلط استعمال کریں ان سے آہنی ہاتھ سے نمٹے تو لاقانونیت کا خاتمہ ہو سکتا ہے لیکن جس طرح کے حالات پیدا کر دیے گئے ہیں ان میں تو یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو مسائل حل نہیں ہونے دیتے اور الٹا انہیں بگاڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور انہیں میڈیا کے ذریعے خوب اچھالتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہماری بعض NGOs اور بعض میڈیا چینلز خدانخواستہ بیرونی قوتوں کے اشارے پر اس طرح کے معاملات کو ہوا دیتے ہیں۔ اس کا توڑ بھی یہی ہے کہ ہمارے علماء کرام، عوام، پولیس ،عدالتیں سب اپنا اپنا کردار موثر طریقے سے ادا کریں، اشتعال نہ پھیلنے دیں اور مجرم کو جلد از جلد کیفر کردار کو پہنچائیں۔

ڈاکٹر محمد امین

سلمان تاثیر والے مشہور معاملے کو بطور مثال لے لیجیے کہ اتنا بڑا واقعہ ہوا لیکن نہ آج تک آسیہ مسیح

والے کیس کا فیصلہ ہوا اور نہ سلمان تاثیر کو قتل کرنے والے کے بارے میں فائنل عدالتی فیصلہ سامنے آیا کہ اس نے قتل توہین رسالت کی بناء پر کیا یا کسی اور وجہ سے حالانکہ قانون کا مشہور جملہ ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے۔

علامہ خلیل الرحمٰن قادری

جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات میں غیر ملکی اور مقامی خفیہ ایجنسیوں کے کردار کا تعلق ہے تو یہ اوپن سیکرٹ ہے اور سب کے علم میں ہے۔ رینڈ کارپوریشن (امریکہ) جیسے مطالعاتی اور تحقیقی اداروں (تھنک ٹینک) کی رپورٹیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اخبارات و جرائد میں مباحثے ہورہے ہیں کہ ان معاملات کے پیچھے امریکہ و بھارت کی خفیہ ایجنسیاں ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری حکومتیں ٹس سے مس نہیں ہوتیں اور مذکورہ غیر ملکی قوتوں کی خوشنودی، تعاون اور دوستی کی طالب اور خواہاں رہتی ہیں۔ ان حالات میں اصلاح احوال کیسے ممکن ہے اور ان حالات میں محض علماء اور دین دار عناصر کو کیسے موردالزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

مولانا زاہد الراشدی

ہم غیر ملکی اور مقامی خفیہ ایجنسیوں کے وجود اور سازشوں کا انکار نہیں کرتے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہ ان کا آلۂ کار کون بنتا ہے؟ اور ان کے ہاتھوں استعمال کون ہوتا ہے؟ ظاہر ہے یہ ہم ہی ہیں، یہ ہمارے ہی آدمی ہیں تو ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے، اپنی صفوں کو سیدھا کرنا چاہیے کہ دشمن کو ہمارے اندر

اللہ کریم

اقوام متحدہ کا ایک یورپی مالی مشیر سوڈان گیا تاکہ وہاں غربت کا جائزہ لے سکے۔ وہ وہاں ایک استاد سے ملا اور اس سے اس کی تنخواہ اور اخراجات کا پوچھا۔ استاد نے جواب دیا کہ اس کی تنخواہ تھوڑی ہے اور مہینے کے تیسرے ہفتے ختم ہوجاتی ہے۔ مشیر صاحب نے اس سے پوچھا ''پھر تم کیا کرتے ہو؟'' مدرس نے جواب دیا ''اللہ کریم'' گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر وہ ایک مزدور سے ملا اور اس کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ تنخواہ تھوڑی ہے لیکن ''اللہ کریم'' کے صدقے گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ اسی طرح کے جوابات اسے کئی دوسرے لوگوں نے بھی دیے۔ واپس جا کر اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''سوڈان میں غربت بہت زیادہ ہے، لوگوں کی تنخواہیں کم ہیں اور ان کا گزارہ نہیں ہوتا لیکن کوئی صاحب ''اللہ کریم'' ہیں جو ہر مہینے کے آخر میں ان کی مالی مدد کردیتے ہیں۔　　(ڈاکٹر انعام اللہ، اٹک)

سے اغیار کی چاکری کرنے والے اور ان کے گماشتے کا کردار ادا کرنے والے نہ ملیں۔ جب ہم اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر ہمیں دوسروں سے گلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

مفتی محمد خان قادری

میر ا

> حب جاہ کی مذمت قرآن وسنت میں واضح الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں ہم نام ونمود کے خواہش مندوں اور شہرت کے طالبوں کے لیے ایک سبق آموز واقعہ اسلامی تاریخ سے نقل کر رہے ہیں۔ مدیر

خیال ہے جو لوگ متعصب یا انتہا پسند ہیں وہ قلیل تعداد میں ہیں البتہ مختلف مسالک کے جمہور علماء کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے مسلک کے انتہا پسندوں کو disown نہیں کرتے اور ان کی حوصلہ شکنی اور مذمت نہیں کرتے۔ میری تجویز یہ ہے کہ جن مسالک کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں ان کے جمہور علماء کو، جو الحمدللہ معتدل مزاج ہیں، ان سے اظہار برأت کرنا چاہیے تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو اور انہیں پتہ چل جائے کہ مسلک کے ذمہ داران ان کے ساتھ نہیں ہیں۔

یہاں ایک بات میں عامۃ الناس سے بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ وہ سطحی اور جذباتی تقریریں کرنے والے مولویوں اور واعظین وذاکرین کی تعظیم وتکریم کرنا چھوڑ دیں اور سنجیدہ، بردبار اور ثقہ علماء کرام پر اعتماد کرنا سیکھیں، ان کو عزت دیں، ان کو رہنما بنائیں تو اس سے بھی صورت حال میں بہتری آئے گی۔

علامہ خلیل الرحمان قادری

بلکہ یہی بات میں میڈیا سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ انہیں جب علماء کا موقف چاہیے ہو تو انہیں مختلف مکاتب فکر ومسالک کے سنجیدہ، ثقہ اور معتدل مزاج علماء کرام سے رابطہ کرنا چاہیے جب کہ دیکھا یہ گیا ہے کہ دینی نمائندگی کے لیے یا تو وہ داڑھی منڈے سکالرز کو بلاتے ہیں یا متجددین کو (جیسا کہ مثلاً غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کو) جنہیں علماء کرام کی اکثریت راست فکر اور دین کا صحیح نمائندہ نہیں سمجھتی یا پھر مسالک کے جونیئر، غیر نمائندہ اور کمزور افراد کو بلاتے ہیں جو موضوع کا حق ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اس کی بجائے اگر وہ مختلف مکاتب فکر کے ثقہ علماء کو بلائیں تو عوام کو زیادہ فائدہ ہو۔

ڈاکٹر محمد امین

آج کی مجلس مذاکرہ میں مختلف مکاتب فکر کے جن ثقہ علماء نے اظہار خیال کیا ہے ان کی گفتگو سے واضح ہے کہ وہ سب قانون توہین رسالت کے غلط استعمال کی مذمت کرتے ہیں اور وہ سب اس امر پر متفق

ہیں کہ قانونی طریق کار اختیار کیا جائے اور ایسے اقدامات سے پرہیز کیا جائے جن سے اشتعال پھیلے اور لوگ قانون کو ہاتھ میں لیں۔ انہوں نے متفقہ طور پر ایسے متعدد اقدامات کی بھی نشان دہی کی ہے جن سے ملک میں فرقہ واریت کی لہر کو کم کیا جاسکتا ہے اور جن پر عمل کر کے مختلف مکاتب فکر مکمل ہم آہنگی سے عوام کی دینی خدمت بجالا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اخلاص اور عمل کی توفیق سے نوازیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوسکے۔ میں آپ سب علماء کرام کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس علمی مجلس کے لئے وقت نکالا اور یہاں تشریف لائے، جزاکم اللہ خیراً۔

تزکیۂ نفس

حب جاہ کے مریضوں کے لیے ایک انجکشن

مسلمہ بن عبدالملک نے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا۔ مسلمانوں کو قلعہ کی دیوار میں ایک جگہ اتنا بڑا سوراخ نظر آیا جس سے بمشکل ایک شخص داخل ہوسکتا تھا۔ لوگوں نے اس سوراخ کی طرف دیکھا اور ایک دوسرے کو توجہ دلائی۔ انہیں اندر کے حالات کی کوئی خبر نہیں تھی کہ اس سوراخ کے پاس کتنے لوگ موجود ہیں، آیا اس شخص کو سوراخ سے نکلنے اور لڑنے کا موقع بھی مل پائے گا یا نہیں؟ یہ سیدھی سادی موت کو گلے لگانے والی بات تھی۔

لوگ ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے کہ سب سے پہلے کون اس کے ذریعہ قلعہ کے اندر جائے۔ اسلامی لشکر میں سے ایک غیر معروف شخص سامنے آیا اور کہا میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اس سوراخ کے

☆ ناظم شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

ذریعے قلعے کے اندر چلا گیا اور صورت حال کو سنبھال لیا۔اس کے بعد اور بھی بہت سے لوگ اس کے ذریعے اندر داخل ہوئے اور مسلمانوں نے قلعہ فتح کرلیا۔فتح کے بعد مسلمہ بن عبدالملک نے اعلان کیا کہ ''صاحب النقب''،یعنی سوراخ کے ذریعہ سب سے پہلے اندر جانے والا شخص میرے پاس آئے لیکن کوئی نہ آیا۔اس نے دوبارہ سہ بارہ یہ اعلان کرایا۔

پھر اعلان کرنے والے کے پاس ایک شخص آیا اور کہا سپہ سالار سے میرے لیے ملاقات کی اجازت حاصل کرو۔اعلان کرنے والے نے پوچھا: کیا آپ ''صاحب النقب'' ہیں اس نے جواب دیا میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔اعلان کرنے والے نے مسلمہ کو بتایا۔مسلمہ نے فوراً اجازت دے دی۔اس شخص نے مسلمہ سے کہا کہ ''صاحب النقب'' کی اپنے بارے میں بتانے کے لیے تین شرطیں ہیں۔مسلمہ نے کہا اس نے ایسا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ہم اس کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہیں۔اس نے کہ کہا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ خلیفہ کو اس کا نام لکھ کر نہ بھیجا جائے۔دوسری شرط یہ ہے کہ اسے کسی انعام کی پیشکش نہ کی جائے۔تیسری شرط یہ ہے کہ اس سے اس کا نام نہ پوچھا جائے اور نہ یہ پوچھا جائے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے۔مسلمہ نے کہا مجھے منظور ہے۔اس شخص نے جواب دیا میں ہی وہ شخص ہوں۔مسلمہ اس واقعہ کے بعد جب بھی نماز پڑھتا تو یہ دعا ضرور کرتا۔''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی مَعَ صَاحِبِ النَّقَب'' اے اللہ مجھے آخرت میں ''صاحب النقب'' کا ساتھ نصیب فرما۔(عیون الاخبار لابن قتیبہ:72/1)

اسلام اور سائنس و ٹیکنالوجی سیّد خالد جامعی ☆

جدید سائنس و ٹیکنالوجی پر ایمان بالغیب کیوں؟
جدید سائنس کے ناقدانہ مطالعے کی ضرورت

گزشتہ کئی ماہ سے جناب محمد رشید صاحب اسلام، سائنس و ٹیکنالوجی کے موضوعات پر برہان میں سو صفحات سے زیادہ لکھ چکے ہیں ان کے اخلاص اور امت کے لیے بے پناہ درد کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے لیکن اس اخلاص کے باوجود ان کی تحریریں محض جذبات غصے اتہام الزام دشنام اور غیر علمی دلائل سے پر ہیں لیکن ان کے دشنام بھی ہمیں شبنم کے قطرے اور پھول کی پتیاں نظر آتی ہیں۔تواتر و تسلسل سے ان کے مضامین کی اشاعت سے یہ التباس پیدا ہو رہا ہے کہ شاید محمد رشید صاحب ان موضوعات پر سند کا درجہ رکھتے ہیں تبھی ان کو برہان جیسے رسالے میں خامہ فرسائی کی اجازت میسر ہے۔ شاید وہ جدید سائنس سے متعلق تمام فلسفیانہ مباحث اس کی مابعد الطبیعیات [Metaphysics]،

جدید سائنس کی تاریخ، سائنس اور فلسفے کے تعلق، فلسفۂ سائنس اور فلسفۂ ٹیکنالوجی کے موضوعات پر عبور رکھتے ہوں اسی لیے تسلسل کے ساتھ انہی موضوعات پر خامہ فرسائی کررہے ہیں لیکن جدید سائنس کے نہایت نازک اور اہم مباحث پر ان کی نظر کتنی گہری ہے اس کا اندازہ ان کی تحریروں کے چند اقتباسات سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱) انسانی مسائل کے حل کے لیے وقوع پذیر ہونے والی سوچ وکاوش سائنس کہلاتی ہے۔ (۲) انسانی سوچ و کاوش یا عقل+علم+ دولت عصر حاضر کی زبان میں سائنس وٹیکنالوجی کہلاتی ہے۔ (۳) خود سائنس اپنے ماننے والوں کو وحی کے ماننے پر اکساتی رہتی ہے۔ سائنس خود اللہ کی ربوبیت پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہے۔ سائنس دراصل عقل، علم اور مال و دولت کی ہی ایک جدید ترین شکل ہے۔ (۴) جو مقام و مرتبہ قدیم دور میں عقل، علم اور مال و دولت کو حاصل ہوا کرتا تھا جدید دور میں وہی مقام و مرتبہ سائنس وٹیکنالوجی کو حاصل ہوگیا ہے۔ (۵) خالد جامعی صاحب بھی سائنس کی درست تعریف نہیں بتارہے وہ مغربی مفکرین کی بیان کردہ سائنس کی تعریف کو درست سمجھتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ [البرہان: اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۲ء، جنوری، فروری، مارچ ۲۰۱۳ء]

محترم ومکرم محمد رشید صاحب نے سائنس کی جو تعریفات اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں فلسفے، فلسفہ سائنس اور فلسفۂ ٹیکنالوجی سے واقف کوئی شخص ان تعریفات کو درست تسلیم نہیں کرسکتا۔ وہ علم، العلم، دولت اور سرمایے کے فرق سے بھی ناواقف ہیں اور علم کی وسیع اصطلاح کو سائنس لکھ رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ خالد جامعی صاحب نے اپنی کسی تحریر میں سائنس کی درست تعریف بیان نہیں کی۔ یہ محض دعویٰ ہے کیونکہ سائنس کے موضوع پر ہماری تحریروں کا مجموعہ زیر طباعت ہے اس کی اشاعت سے قبل ہی اس پر اعتراض قبل از وقت ہے۔ اکثر امریکی جامعات میں سائنس کے حوالے سے ایک اہم ترین کتاب What is this thing called science? جو بہت آسان ہے نصاب میں داخل ہے ہم محترم محمد رشید صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ فرمالیں تا کہ ان کے افکار و آراء کی علمی بنیادوں پر اصلاح ہوسکے۔

اس صدی کے آئن سٹائن فائن مین کی کتاب Six Easy Peices جو نہایت آسان کتاب ہے اور امریکی جامعات کے نصاب میں داخل ہے بھی اگر محمد رشید صاحب ملاحظہ فرمالیں تو انہیں سائنس کی تعریف اور سائنس کی اصل حقیقت کے تعین میں کوئی اشتباہ، ابہام، اشکال، تردد اور تذبذب نہیں رہے گا اس سلسلے میں چند مزید کتابوں کے حوالے درج کیے جارہے ہیں جن کے مطالعے کے بعد ہی

محمد رشید صاحب سے اس عہد کے سب سے اہم موضوع پر کسی مکالمے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

- A. F. Chalmers, *What Is This Thing Called Science?*: *An Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods,* U.S.A.:Open University Press , 1988,

- Husrel: *The Crises of European Sciences and Transcendental Phenomenology: An Introduction to Phenomenological Philosophy,*[Evanstn: Northwestern University Press,1970.]

- *The Question Concerning Technology in Martin: Heidegger's Basic Writings*,[Ed.,David Farrell Krell,New York: Harper Collins Publications, 1970.]

- Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces: Essentials of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher*, USA: Helix Books,1995

- K. P. Popper, *Conjectures and Refutation.* London: Routledge & Kegan Paul, 1963

- P.K Feyerabend, *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge,* London: New Left Books, 1975

- P.K Feyerabend, *Science in a Free Society, New Left Books,* 1978

- P. Feyerabend, *Farewell to Reasen,* London: Veso Newleft books 1987

- Imre Lakatos & A Musgrave[ed.], *Falsification & the Methodology of Scientific Research Programmes in Criticism and the Growth of Knowledge,* Cambridge: Cambridge University

Press, 1974,

- K.R. Popper, *Objective Knowledge*, Oxford: Oxford University Press, 1979

"Seeking New Laws of Nature" *Richard Feynman*

- Richird Feynman, *The Character of Physical Law*. MIT Press 1993

محمد رشید صاحب کا خیال ہے کہ سائنس مغرب کے لوگوں پر وحی الٰہی کی حقیقت کھول دے گی اور وہ اسلام میں آ جائیں گے لیکن اس کی حقیقت کیا ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ علم طبیعیات [فزکس] کو سائنس میں ملکۂ سائنس [Queen of Science] کہا جاتا ہے، کوئی سائنسی علم اور تجربہ علم طبیعیات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا اس کے باوجود علم طبیعیات کا سفر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے یا پسپائی اختیار کر رہا ہے؟ اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین جو کوآنٹم فزکس کا سب سے بڑا سائنس داں ہے اس کی زبان سے اس سائنس کی اعلیٰ ترین شاخ کے بارے میں سنیے

It would be impossible to predict exactly what would happen. We can only predict the odds! This would mean, if it were true, that physics has given up on the problem of trying to predict exactly what will happen in a definite circumstance. Yes! Physics has given up. We do not know how to predict what would happen in a given circumstance, and we believe now that it is impossible, that the only thing that can be predicted is the probability of different events. It must be recognized that this is a retrenchment in our earlier ideal of understanding nature. It may be a backward step, but no one has seen a way to avoid it.

سائنس کے بارے میں محترم محمد رشید صاحب کو جو ایقان، اطمینان اور نفس مطمئنہ حاصل ہے وہ اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین کو بھی حاصل نہیں وہ سائنس کی حقیقت کے بارے میں انکشاف کرتا ہے۔

This is a horrible thing; in fact, philosophers have said

before that one of the fundamental requisites of science is that whenever you set up the same conditions, the same thing must happen. This is simply not true, it is not a fundamental condition of science. The fact is that the same thing does not happen, that we can find only an average, statistically, as to what happens. Nevertheless, science has not completely collapsed. Philosophers, incidentally, say a great deal about what is absolutely necessary for science, and it is always, so far as one can see, rather naive, and probably wrong. For example, some philosopher or other said it is fundamental to the scientific effort that if an experiment is performed in, say, Stockholm, and then the same experiment is done in, say, Quito, the same results must occur. That is quite false. It is not necessary that science do that; it may be a fact of experience, but it is not necessary.

مسئلہ یہ ہے کہ محمد رشید صاحب جیسے نہایت متقی، راسخ العقیدہ اور مخلص انقلابی مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کا مقابلہ صرف اور صرف سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اگر ہم اس معاملے میں مغرب سے پیچھے رہ گئے تو انقلاب کی صبح کبھی طلوع نہیں ہوگی ایک فرض کفایہ علم جس کا انحصار صرف اور صرف مغرب پر ہے صرف اس کے حصول سے اللہ کے دین کے غلبے کو مشروط کرنا اسلامی علمیت، اسلامی تاریخ، تعامل امت اور اجماع امت سے غض بصر کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں نے تاتاریوں کو اسلحہ سے شکست نہیں دی۔ افغانستان پر حملہ کرنے والوں کو طالبان جیسے کم زور لوگوں سے مذاکرات کی میز پر آنا پڑا جبکہ صدر بش نے کہا تھا کہ دہشت گردوں سے مذاکرات نہیں ہوں گے۔ آخری دہشت گرد کے خاتمے تک ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

محمد رشید صاحب کو سائنس کے بارے میں بہت زیادہ خوش فہمی ہے علم سائنس کا ایک اہم مفکر لے کاٹوش سائنس، سائنسی منصوبوں اور سائنس دانوں کی حقیقت کے بارے میں لکھتا ہے:

''ایک سائنس داں کسی سیارے کے مدار کے بارے میں نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل کے تحت مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ فرض کریں کہ اس سیارے کے مشاہدہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریے کے بتائے ہوئے مدار پر سفر نہیں کر رہا۔ کیا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل غلط ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا کہ اس سیارے کے نزدیک اب کوئی نامعلوم سیارہ موجود ہوگا جس کی کشش کی وجہ سے زیر مطالعہ سیارہ اپنے مدار سے ہٹ کر سفر کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس نامعلوم سیارے کے وزن، حجم اور مدار کے بارے میں حساب وتخمینہ لگاتا ہے اور پھر اپنے ساتھی سائنس دانوں کو اس نامعلوم سیارے کے مشاہدہ کا کام سپرد کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نامعلوم سیارہ اتنا چھوٹا ہو کہ اب تک کی طاقتور ترین دوربین کی مدد سے بھی نہ دیکھا جاسکتا ہو لہٰذا وہ سائنس دان حکومت سے ریسرچ کی مد میں فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک بڑی اور طاقتور دوربین تیار کی جاسکے۔ لگ بھگ تین برس کے عرصے میں ایک نئی دوربین تیار کرلی جاتی ہے۔ اگر تو اس دوربین کی مدد سے وہ نامعلوم سیارہ نظر آجائے تو سائنس دان خوشیاں منائیں گے کہ نیوٹن کے نظریے کی ایک بار پھر تصدیق ہوگئی۔ فرض کریں وہ نامعلوم سیارہ دوربین میں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا سائنس دان اسے نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟ نہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ دراصل ایک فضائی بادل [Cloud of Cosmic Dust] نے اس نامعلوم سیارے کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ سیارہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ چنانچہ سائنس دان مزید ریسرچ فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک خلائی شٹل بادل کے مشاہدے کے لیے بھیجی جاسکے۔ اگر خلائی شٹل کسی ایسے بادل کی نشاندہی کردے تو اسے نیوٹن کے نظریے کی زبردست کامیابی قرار دیا جائے گا۔ لیکن فرض کریں وہ بادل بھی نہ پایا جائے کیا اب سائنس دان نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل بشمول اپنے خیالات کہ ایک نامعلوم سیارہ ہے یا یہ کہ ایک فضائی بادل ہے کی تردید کردیں گے؟ نہیں بلکہ اب وہ کہیں گے کہ کائنات کے اس حصے میں کوئی مقناطیسی قوت [Magnetic Field] ہے جس نے سیٹلائیٹ کے آلات کو صحیح کام نہیں کرنے دیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ بادل دریافت نہ ہوسکا۔ چنانچہ ایک نئی قسم کی خلائی شٹل تیار کرکے فضا میں بھیجی جاتی ہے۔ اگر وہ مقناطیسی قوت وہاں مل جائے تو نیوٹن کے مداح سائنس دانوں کی خوشی کی انتہا نہ ہوگی۔ لیکن فرض کریں ایسا نہ ہوسکے تو کیا اب وہ نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟ نہیں بلکہ وہ ایک نیا اضافی مفروضہ تراشیں گے.......... یہاں تک کہ یہ سالوں پر محیط کہانی تحقیقی رسالوں کی اقساط میں دب کر گم ہوجاتی ہے اور پھر کبھی بیان نہیں کی جاتی۔

–[Imre Lakotos and A. Musgrave [ed.], *Falsification & Methodology of Scientific Research Programme*, in *Criticism and the*

Growth of Knowledge, Cambridge: Cambridge University Press, 1974

اگر جناب محمد رشید صاحب کو کتابوں کے حصول میں دشواری ہوتو وہ درج ذیل کتب کا مطالعہ فرما سکتے ہیں جن سے ۱۸ ویں صدی سے پہلے کی سائنس، جدید سائنس اور ۱۹ ویں صدی تک عالم اسلام میں سائنسی سرگرمیوں کے بارے میں انہیں درست اطلاعات، معلومات اور حقائق مل سکتے ہیں:

(۱) ڈاکٹر حسین نصر کی کتاب Islam in the Modern World 2010 کا باب Philosophy & Science

(۲) گائی ایٹن کی کتاب King of the Castle کا چھٹا باب Knowledge and its counter feits جو سائنس سے متعلق ہے۔

(۳) ایک دینی مدرسے کے طالب علم جناب محمد ظفر اقبال کی کتاب ''اسلام اور جدید سائنس، نئے تناظر میں''

(۴) Lord North Boune کی کتاب Religion in the Modern World کا پانچواں باب جو جدید سائنس سے متعلق ہے۔

(۵) Rene Guenon کی کتاب The Crises of the Modern World جس میں رینے نے **سطحی سائنس اور مقدس سائنس** پر خامہ فرسائی کی ہے اور بتایا ہے کہ قدیم علوم کی تلچھٹ سے جدید سائنسی علوم کس طرح ابھرتے ہیں۔ فزکس، نجوم اور کیمیا جیسے علوم روایتی تہذیبوں اور مغرب کی قدیم تہذیب میں کیا تھے اور جدید دور میں کیا ہو گئے ہیں۔

(۶) رینے گینوں کی کتاب The Reign of Quantity کا باب ہشتم جس میں جدید صنعتوں اور قدیم صنعت وحرفت کا اساسی فرق بتایا گیا ہے۔ محترم محمد رشید صاحب اس کتاب کے باب اٹھارہ کا خصوصی مطالعہ فرمائیں جس میں مصنف نے طبعیات اور حیاتیات کے علوم سے سائنسی دیو مالاؤں کے بارے میں ٹھوس مثالیں پیش کی ہیں۔

(۷) حسین نصر کی کتاب Science & Civilization in Islam

(۸) جناب محمد رشید صاحب کو ان کتابوں کی تلاش میں زحمت ہوتو انٹرنیٹ پر اسٹین فورڈ انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی سے وہ

[1] Technology, [2] Science & Pseudo Science, [3] of Sciencetific Progress, [4] Cognitive Science, [5] The Social dimensions of Scientific Knowledge.

جیسے اہم موضوعات پر مقالہ جات حاصل کر سکتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ سائنس، سائنٹفک میتھڈ، وغیرہ کے بارے میں بھی وہ اس ویب سائٹ سے استفادہ نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں۔

(۹) فلسفہ سائنس پر Jan Kyrre Berg Otsen وغیرہ کی مرتبہ کتاب *New Waves in Philosophy of Technology* پڑھ سکتے ہیں۔ اسی مصنف کے قلم سے *Five Questions in Philosophy of Technology* اور Technology & Science کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

(۱۰) Evan Selinger کی کتاب *CHASING TECHNO SCIENCE* بھی مفید رہے گی۔

(۱۱) J. Ellul، Th. Roszak اور L Mumford کی کتابیں بھی آپ کے لیے سائنس وٹیکنالوجی اور عہد حاضر کے حوالے سے اہم مباحث کے منکشف ہونے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

(۱۲) Ted Peters کی مرتبہ کتاب God, Life & The Cosmos، اور ڈاکٹر ظفر اقبال کی کتاب Islam and Modern Science اور احمد دلال کا مقالہ Science & Religion قارئین برہان اور محمد رشید صاحب کے علم میں اضافے کا سبب بنے گا۔

(۱۳) تھامس کوہن Kuhan کی کتاب The Structure of Scientific Revolution کا مطالعہ بھی آپ کے لیے سودمند رہے گا۔

(۱۴) Wolfgang Sachs کی کتاب *The Development Dictionary* کا مطالعہ ہر اس فرد کے لیے لازمی ہے جو تحریر وتقریر کے میدان میں مصروف عمل ہے۔ یہ کتاب مخلص دینی لوگوں کو عہد حاضر کی عقلیات، اصطلاحات اور ان کی مابعد الطبیعیات سے بخوبی آگاہ کرتی ہے۔ امید ہے جناب محمد رشید صاحب جو فن تحریر پر عبور رکھتے ہیں ان موضوعات پر بھی عبور حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو محض شعلہ مقالی کے سہارے برہان کے صفحات پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں کانٹ کے فلسفے نے علم کی دنیا میں جو تغیرات پیدا کیے ان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کانٹ کی کتاب **تنقید عقل محض** *(Critique on pure Reason)* ایک اہم کتاب ہے کانٹ کا مضمون *What is enlightenment* ہمیں مختصراً روشن خیال، ماڈرن مین، جدید علوم، جدید مابعد الطبیعیات، جدید تصورات علم کے بارے میں بنیادی آ گہی عطا کرتا ہے۔ جدید انسان کے ظہور کے بغیر جدید سائنسی علوم کا ظہور ممکن نہیں تھا چونکہ محمد رشید صاحب کو ان مباحث پر لکھنے کا شوق ہے تو وہ ان موضوعات پر مطالعے میں رسوخ پیدا کریں جدیدیت نے جدید علم اور جدید مابعد الطبیعیات کے ذریعے مذہب کو کیسے شکست دی اور جدید علوم کے نتیجے میں مذہبی ذہن کیوں تعمیر نہیں ہوسکتا؟ اس سلسلے میں درج ذیل کتب اور مضامین کا مطالعہ مفید رہے گا۔

(۱) امریکہ کے سب سے بڑے فلسفی رچرڈ رارٹی کا مقالہ *Is Philosophy Relevent to Applied Ethics?* ۔ یہ مقالہ Business Ethic Quarterly Volum 16 میں شامل ہے اور نیٹ پر دستیاب ہے۔ (۲) اس صدی کے سب سے بڑے زندہ فلسفی Jurgen Habermas یرگن ہیبر ماس کا مقالہ *What is Meant by a post secular society? Discussion on Islam in Europe* ۔ یہ مقالہ اس کی کتاب The Faltering Project میں شامل ہے۔ (۳) ہارورڈ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر نائیل فرگوسن Niall Ferguson کی کتابیں *The West & the Rest* ، *The great degeneration* ۔ (۴) امریکہ کے سب سے بڑے مورخ Jared Diamond کی کتاب *The world until yesterday at another Air Port From the Jungle to the 405* اس کتاب کا آخری باب محمد رشید صاحب کے لیے چشم کشا ہوگا۔ اس باب میں ڈائمنڈ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ جدید سائنس کی عظیم الشان ترقیات کے ساتھ ساتھ قدیم معاشروں خصوصاً نیو گنی (New Guinea) جیسے روایتی معاشروں کی اخلاقیات، اقدار، خاندانی نظام، رشتے ناطے، سماجی رویے بچوں سے محبت، بڑوں کی عزت، مہمان نوازی، سکون قلب، جدید مغربی معاشروں کو حاصل ہوجائے۔ پاکستانی جدیدیت پسندوں کے الفاظ میں اگر کہا جائے تو جدید وقدیم اکٹھے ہوجائیں۔ مشرق و مغرب میں پل تعمیر ہوجائے جدید وقدیم میں تطبیق پیدا ہو، یعنی زندگی فرعون کی طرح عالیشان ہو اور روحانیت معاشرت اخلاقیات حضرت موسیٰ کی حاصل ہوجائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ ڈائمنڈ نے لکھا ہے کہ نیوگنی میں کسی بھی گھر کا کوئی بچہ کسی بھی گھر میں ناشتے، دوپہر کے کھانے یا رات کے کھانے کے وقت چلا جائے تو ہر گھر میں اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ ڈائمنڈ کی خواہش ہے کہ یہ طرز اخلاق، طرز معاشرت

امریکہ یورپ کی جدید سائنسی صنعتی زندگی کا حصہ بن جائے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عورت جو صبح سویرے کام کے لیے نکلی ہو، شام کے وقت گھر آئی ہو، اس کے پاس اپنے بچوں کو دودھ پلانے، کھانا کھلانے کا وقت نہیں وہ انھیں ڈے کیئر سنٹر کے سپرد کر کے جاتی ہے، وہ عورت دوسرے کے بچے کا استقبال کیسے کر سکتی ہے؟ دوسرے کی مہمان نوازی اپنے دسترخوان پر اسے کیسے گوارا ہوگی؟ جدید طرز زندگی، جدید معیارات زندگی، مغرب کی اقدار و روایات آپ قبول کر لیں اور اسلام کی روایات و اقدار بھی باقی رہیں یہ کیسے ممکن ہے جناب محمد رشید صاحب جیسے مخلص لوگ جذبات میں آنے، غصہ کرنے اور گالیاں دینے کی بجائے ان مباحث کو گہری نظر سے دیکھیں، آپس میں مل بیٹھیں، تبادلہ خیالات کریں، ایک دوسرے سے مستفید ہوں، رسالوں کے صفحات پر غصہ اتارنے کی بجائے ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں۔ ہم ان کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور ان سے ہر طرح کے تعاون اور گفتگو کے لیے ہر وقت تیار ہیں ہمارے دل میں ان کے لیے بے پناہ قدر و منزلت ہے وہ نہایت مخلص مسلمان ہیں کہ ان کا ایمان ان کی تحریر کے ہر لفظ سے واضح ہے۔

اگر محمد رشید صاحب ان کتابوں کے مطالعے کے بعد جدید سائنس اور اسلام کے عنوان پر خامہ فرسائی فرمائیں تو شاید ان کے دلائل میں کچھ وزن پیدا ہو سکے، صرف اخلاص علم کا متبادل نہیں ہو سکتا۔

جناب محمد رشید صاحب کو شکوہ ہے کہ ساحل جدیدیت پسند مفکرین جناب یوسف القرضاوی اور طہٰ جابر العلوانی جیسے جلیل القدر علماء کی عزت نہیں کرتا یہ الزام عائد کرتے ہوئے وہ بھول گئے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بدعت کی تعظیم و اکرام سے منع فرمایا ہے وہ لوگ جو اسلام اور کفر کی جنگ میں امریکہ کے ساتھ کھڑے ہوں اور طالبان کو قتل کرنے کا فتویٰ دے رہے ہوں ان کی عزت کیسے کی جا سکتی ہے؟ جناب قرضاوی صاحب کون ہیں اس حقیقت کو جاننے کے لیے ان کا وہ فتویٰ پڑھ لیجیے جو امریکی فوج میں کام کرنے والے مسلمانوں کو افغانستان پر حملے کے وقت دیا گیا مستفتی نے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا مسلمان امریکی فوجی افغانستان پر حملہ کر سکتے ہیں طالبان کا خون بہا سکتے ہیں اس کے جواب میں قرضاوی صاحب نے فتوی دیا کہ امریکہ افغانستان ہی نہیں دنیا میں جہاں بھی حملہ کرے مسلمان فوجی ان حملوں میں شریک ہوں اس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا استثناء بھی قرضاوی صاحب نے نہیں رکھا۔ یہ فتویٰ ان کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ قرضاوی صاحب لکھتے ہیں:

یہ فتویٰ امریکی مسلح افواج کے سینئر ترین امام محمد عبد الرشید کے سوالات کے جواب میں پیش کیا گیا ھے۔ ان سوالات کا تعلق امریکی افواج میں موجود مسلمان فوجیوں کی افغانستان اور دوسرے مسلمان ممالک میں جاری امریکی عسکری یلغار میں حصہ لینے کی اجازت سے ہے۔ **اپنے سوال میں انھوں نے امریکی عسکری یلغار (جنگ) کے مندرجہ ذیل مقاصد بیان کیے ھیں۔**

(ا)ان لوگوں سے انتقام لینا جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے گیارہ ستمبر کے خودکش دھماکوں کی منصوبہ بندی اور مالی اعانت کی۔(۲)ان عناصر کی بیخ کنی کرنا جو افغانستان اور دوسرے مقامات کو اپنی محفوظ پناہ گاہوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں نیز ان حکومتوں کو روکنا جو ان کی پشت پناہی کرتی ہیں اور ان کو عسکری تربیت کے مواقع مہیا کرتی ہیں تا کہ وہ دنیا بھر میں اپنے مقاصد حاصل کرسکیں۔(۳)دنیا بھر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لیے مطلق العنان واحد طاقت کی حیثیت سے تعظیم وتکریم کو دوبارہ قائم کرنا۔ Restoring the venreation and respect to the US as a super power in the world.

انھوں نے اپنے ان سوالات کا اختتام اس وضاحت پر کیا ہے کہ امریکی فوج کی تینوں شاخوں میں ۱۵ ہزار سے زائد مسلمان عسکری خدمات انجام دے رہے ہیں لہذا اگر وہ اس فوج کشی میں شرکت سے انکار کرتے ہیں تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا کہ وہ امریکی فوج سے مستعفی ہوجائیں۔جس کے نتیجے میں انھیں متعدد دوسرے شدید نقصانات بھگتنے کا شدید اندیشہ ہے۔آخر میں انھوں نے یہ بھی استفسار کیا ہے کہ آیا وہ لوگ میدان جنگ سے تبادلہ کرواسکتے ہیں کیا انھیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ایسے عہدوں پر اپنا تبادلہ کروالیں جس کا تعلق براہ راست جنگ سے نہ ہو۔

جواب: تمام مسلمانوں کو ان لوگوں کے خلاف متحد ہوجانا چاہیے جو معصوم لوگوں کو دہشت زدہ کرتے ہیں اور بغیر کسی وجہ کے نہتے لوگوں کے قتل کی اجازت دیتے ہیں۔

امریکہ میں دہشت گردی کے جو واقعات رونما ہورہے ہیں انھیں اسلامی قانون اور فقہ کی رو سے دیکھا جائے تو حرابہ (معاشرہ کے خلاف جنگ) کا جرم تصور کیا جائے گا۔اور اس کا اطلاق ان جرائم کے مرتکب افراد پر ہوگا۔

لہذا ہمیں ان جرائم کا ارتکاب کرنے والے حقیقی مجرموں کو جاننا ہوگا اس کے ساتھ ہی ان افراد کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہوں گی جو دہشت گردی کی تحریک دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں معاشی

اور دیگر ترغیبات فراہم کرتے ہیں۔ ایسے افراد کو لازمی طور پر انصاف کے کٹہرے میں لانا ہوگا اور غیر جانبدار عدالتوں کے ذریعے ان کو سزا دلوانی ہوگی اس طرح یہ عمل ان کے اور دوسروں کے لیے سبق ہوگا جو معصوموں کو ناحق قتل کرتے ہیں املاک تباہ کرتے ہیں اور لوگوں کو دہشت زدہ کرتے ہیں۔

دوسری طرف امریکی مسلمان فوجی مردوں اور عورتوں میں بے چینی کی اصل وجہ یہ احساس ہے کہ وہ دوسرے مظلوم مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ میں حصہ دار ہوتے رہے ہیں۔ اصل مجرمین (جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے) اور معصومین (جنھوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا) کے درمیان تفریق کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جب دو مسلمان آپس میں لڑیں اور ان میں سے ایک قتل ہوجائے تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔" کسی نے کہا یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ قاتل جہنم میں جائے مگر مقتول کیوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیوں کہ وہ دوسرے کو قتل کرنا چاہتا تھا"۔ (بخاری و مسلم)

یہ حدیث صرف اس صورتحال سے متعلق ہے جب کوئی مسلمان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہو اور لڑنا یا نہ لڑنا اس کے اختیار میں ہو۔ یہ حدیث اس صورتحال کی طرف اشارہ نہیں کرتی جس میں ایک مسلمان کسی غیر مسلم ریاست کا شہری ہو اور اس کی فوج کا حصہ ہو اور اس کے پاس احکامات کی بجا آوری کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ دوسری صورت میں اس کی ریاست سے وفاداری اور لگاؤ مشتبہ ہو سکتے ہیں۔ اور یہ اس کے لیے نہ صرف نقصان کا باعث ہو سکتا ہے بلکہ اس کے شہری حقوق و مراعات بھی متاثر ہو سکتی ہیں۔

مسلمان فوجیوں کو لازمی طور پر اس جنگ میں اپنی ذمہ داریاں کو بغیر کسی بے چینی کے احساس کے ساتھ "بلا امتیاز" ادا کرنی چاہیئیں اس کی نیت سچ کا ساتھ دینا اور برائی کو شکست دینا ہو نیز ان کا مقصد معصوموں پر ہونے والے جبر کو روکنا اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے تک پہچانا ہو۔

نیز اللہ تعالیٰ کی نظر میں اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی مخلوق پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

مسلمان ایک جسد واحد کی طرح ہیں اگر ایک فرار کی راہ اختیار کرتا ہے اس کا نکلنا نہ صرف اس کے لیے بلکہ اس کے ملک میں پوری مسلمان برادری کے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور یہاں پر تو لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔

اس سوالنامے میں امریکی مسلم افواج کے مسلم عساکرین جو پچھلی صفوں میں کام کرنے والے ہیں مثلاً امدادی کارروائی کا شعبہ اور اس سے متعلقہ افراد کے لیے سوال کیا گیا ہے کہ آیا وہ امدادی خدمات اور اس طرح کی دوسری ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ان خدمات کی اجازت حکام کی طرف سے دی گئی ہو اور اس میں امریکی فوجیوں یا امریکی مسلمان شہریوں کو نقصان کا کوئی احتمال نہیں ہے تو انھیں اس کی درخواست کرنی چاہیے لیکن اگر یہ درخواست ان کی (امریکہ سے) وفاداری کو خطرے میں ڈالے، ان کو مشتبہ کرے یا ان کی حب الوطنی کو مشکوک کرے تو پھر انہیں یہ درخواست دائر کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مختصراً امریکی مسلمان فوجیوں کے لیے اس بات کی اجازت ہے اور یہ اجازت خدا کی مرضی کے مطابق ہے کہ وہ آئندہ درپیش لڑائیوں میں حصہ لیں خواہ وہ کسی کے بھی خلاف ہوں جن کے بارے میں ان کا ملک فیصلہ کرتا ہے۔ جنھوں نے ان کے خلاف دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے۔

شیخ قرضاوی طالبان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اسے جاننے کے لیے ہارورڈ سے شائع ہونے والی کتاب Islam without fear کا مطالعہ کیا جائے اس کتاب میں شیخ قرضاوی کے نرم ،معذرت خواہانہ،محرف اسلام Soft Islam اور مصر میں ان کے فکری ورثاء جو اخوان المسلمون کے منحرف لوگ ہیں اور جن کی جماعت ''حزب وسط'' کہلاتی ہے ان کے جدید اسلام کی تفصیلات مہیا کی گئی ہیں اس اسلام کو خوف وخطر سے معریٰ بلکہ مبرّا اسلام کہہ کر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسا اسلام مغرب کے فلسفے سے ہم آہنگ ہے اور ماڈرن اسلام ہے قرضاوی صاحب طالبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

طالبان نے کابل کو اور تمام حکومتی نظام کو تباہ کر دیا، طاقت کا بے دریغ اور بے جا استعمال کیا، عورتوں کو کام کرنے سے جبراً روک دیا، لڑکیوں کے مدرسے بند کر دیے، لوگوں کو داڑھیاں بڑھانے اور سر پر ٹوپیاں رکھنے پر مجبور کیا۔ وہ یہ بھول گئے کہ اسلام یہ نہیں ہے اصل اسلام تو ''عدل'' [Justice] ہے، اسلام کی روح اور مغز عدل میں پنہاں ہے۔ طالبان جاہل مسلمان تھے جو روایات کو مذہب سمجھ بیٹھے وہ متن وحی کو جانتے تھے لیکن جو چیزیں ان کے مقاصد و مطالب کے مطابق تھیں وحی الٰہی سے انھوں نے صرف انہی چیزوں کو اخذ کیا۔ اس جاہلیت کے باعث اسلام کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔ کسی حکومت کو اسلامی اس وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ ترقی [progress] کے ذریعے عدل [justice] کا قیام کر سکے جو اسلام کی کلیدی قدر ہے۔ طالبان نے ہمارے دل توڑ دیے ہیں، ان کی قدامت پرستی اور جھگڑالو طبیعت نے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن قرضاوی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے فتوے نے امت مسلمہ کی اسلامی علمیت کو کتنا

نقصان پہنچایا۔ دہشت گردی کے نام پر دہشت گردوں کو فقہی جواز عطا کر کے۔۔۔

طٰہٰ جابر العلوانی صاحب کے ادارے **المعهد العالمي للفكر الاسلامي**، امریکہ کے تحت یوسف حامد العالم کی کتاب **المقاصد العامة للشريعة الاسلاميه** ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کی اشاعت کے مقاصد کے لیے العلوانی صاحب کے تعارف اور یوسف العالم کے مقدمے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

استاد یوسف حامد نے اپنے مقدمے میں کتاب کا مقصد واضح کر دیا ہے ''حواس اور وحی کے ساتھ عقل کے تعلق کا مسئلہ۔ میں نے وسائل وادراک کے تین دائرے متعین کیے ہیں جو حواس سے شروع ہو کر وحی پر ختم ہوتے ہیں۔ درمیان میں عقل کا درجہ ہے۔ ہر دائرے کا میدان الگ ہے اور الگ جولان گاہ ہے جس میں اس کا عمل جاری رہتا ہے۔ کوئی چیز اپنے دائرہ کار سے تجاوز نہیں کر سکتی البتہ دوسرے کی معاونت کرتی ہے، اس سے ٹکراتی ہے نہ اس کی نفی کرتی ہے۔ جب ان میں سے ہر ایک کے دائرہ کار کو سمجھنے میں غلطی ہو یا ان کے باہمی تعلق کے بارے میں غلط فہمی ہو تو اس کے نتیجے میں اعتقادات، غور و فکر اور کردار و عمل میں بے شمار مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج تک جتنے مفاسد ہیں وہ سب ان کے دائرہ کار کو نہ سمجھنے یا ان کے باہمی تعلق کا صحیح ادراک نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ آج کل جو فکری بے راہ روی نظر آ رہی ہے اس کا واحد سبب یہی ہے۔ وحی اپنے دائرہ کار سے تجاوز نہیں کر سکتی بلکہ وہ دوسرے دائروں کی معاونت کرتی ہے''۔ یہ عجیب نقطۂ نظر ہے کہ وحی مقید بحدود ہے ہر شے کو محیط نہیں ہے۔ وحی جو ہر دائرے پر غالب اور زندگی کے ہر راستے کی رہنما ہے اس کو حدود و قیود کا پابند کر دیا جائے اور اس کی سب پر بالاتری کو دائرہ کار سے تجاوز بھی قرار دیا جائے۔

العلوانی صاحب کے ادارے المعہد العالمی کے تحت تعبیر دین کی جدید کوشش کے اس مقدمے کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ ''تمام آسمانی شریعتیں انسانوں پر سے تنگی دور کرنے، نقصان سے بچانے، مصلحتوں کا تحفظ کرنے اور انسان کو بوجھ اور زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے آئیں جو انسان نے خود پر ڈال رکھی ہیں۔

طٰہٰ جابر العلوانی اس کتاب کے تعارف میں امت کے زوال و انحطاط کا سبب بتاتے ہوئے کہتے ہیں: ''حکم کی علت کے فہم کا تباہ کن نقطۂ نظر تھا جس نے تقلید کو پروان چڑھایا اور اجتہاد سے تنفر پیدا کیا۔ اسلامی تاریخ میں حکم شرعی کی علت، مقصد، غایت کی تلاش کو درست رویہ نہیں سمجھا گیا اس کی وجہ سے مقاصد شریعت کے مباحث غیر اہم ہو گئے''۔

☆ ایوان علم و ادب، کندھ کوٹ، ضلع جیکب آباد، سندھ

واضح رہے کہ شیخ العلوانی نے "فقہ الاقلیات" کے تحت امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو انتخابات میں بھر پور طریقے سے حصہ لینے کا حکم دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں کا امریکی شہریت اختیار کرنا لازم ہے۔ شیخ صاحب کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ امریکی شہریت حاصل کرنے میں کوئی امر شرعی مانع نہیں جبکہ امریکی شہریت کے حصول کے لیے جو حلف اٹھایا جاتا ہے اس میں اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کی تمام وفاداریوں کا مرکز ومحور صرف امریکہ اور اس کا دستور ہے۔ اس حلف نامے کے بارے میں جناب ڈاکٹر محمد امین مدیر' البرہان' فروری ۲۰۱۳ء کے شمارے میں فتویٰ دے چکے ہیں۔ (جاری ہے)

اتحاد امت

پروفیسر عبدالخالق بلوچ ☆

اتحاد بین المسالک میں ناکامی

علماء کرام کی خدمت میں ۱۲ سوال

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب آفاقی پیغام دینے والی، عالمی اسلامی ریاست قائم کرنے والی اور کائناتی فکر رکھنے والی مسلم امت 72 فرقوں میں بٹ جائے تو اس کا لازمی، مہلک اور افسوسناک نتیجہ زوال امت ہی ہو سکتا ہے، جو سب کے سامنے ہے۔ جس دین (اسلام) نے رنگ ونسل، وطن اور زبان کے بد ترین اختلافات مٹا کر مسلمانوں کو بنیان مرصوص بنایا تھا اور **واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا** کا درس دے کر اقوام عالم کو ان کا تابع و باج گزار بنایا تھا، جن کو حکم تھا کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر

افسوس صد افسوس کہ اس دین کے نام لیوا باہم دگر دست وگریباں ہو گئے۔ مؤمن ومسلم کا خطاب پانے والے، شیعہ سنی فرقہ پرستی میں بٹ گئے۔ ملت بیضاء کے منصب پر فائز ہونے والے منتشر ہو کر رکھ

کا ڈھیر بن گئے اور چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل میں الجھ کر اس طرح گم ہو گئے کہ گویا ان کا ملی وجود ہی باقی نہیں رہا۔ اب ان کی تمام تر مساعی کا محور رفع یدین، آمین بالجہر، نور بشر، حاضر ناظر، گیارہویں اور علم و تعزیہ جیسے چھوٹے مسائل پر لڑ کر اپنی جگ ہنسائی کا سامان کرنے کے سوا کچھ نہیں رہا۔

تمام کلمہ گو حضرات سنی، شیعہ، مقلد غیر مقلد، دیوبندی اور بریلوی مسلمانوں کا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، کعبہ ایک اور کلمہ پاک ایک۔ پھر یہ سب لوگ ایک امت کیوں نہیں بن جاتے؟ اب وقت کا تقاضا ہے کہ سب گروہ اپنی بنیاد اور نسبت کو نہ بھولیں، ایک دوسرے کو اسلام سے خارج کرنے کا شغل نہ فرمائیں، زخموں سے چُور اور چرکوں سے نڈھال اس امت محمدیہ کی رسوائی کا مزید سامان نہ کریں بلکہ اس کے زخموں پر پھاہا رکھنے کا اہتمام کریں، اس کی اشک شوئی کریں، اس کے دردوں کا مداوا کریں، اس کی گریہ زاری پر کان دھریں اور اس کی فریاد رسی کریں۔ باطل کے مقابلہ میں آپس میں مل کر اس کی

قیادت اور رہنمائی کریں صحیح سمت میں اس کی دستگیری کریں۔ یہ ان کا اسلامی، اخلاقی، مذہبی اور ملی فریضہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونے میں ہی دونوں جہانوں کی سعادت و سرخ روئی ہے۔

عالمی کفر، امت محمدیہ کو مسلمان کو طور پر دیکھتا ہے، خواہ مسلمان ایران کے شیعہ ہوں یا پاکستان کے سنی، ہندوستان کے دیوبندی و بریلوی ہوں یا سعودی عرب کے حنبلی اور اہل حدیث ہوں۔ دنیا کے نقشہ اور اقوام متحدہ کے دفتر میں یہ سب ممالک مسلمان سمجھے جاتے ہیں، مگر ہم ہیں کہ ابھی ہمارے اندر کفر و اسلام کا معرکہ برپا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے فتوؤں کے مطابق کافر اور گمراہ ہیں، ضال مضل ہیں تو پھر خدا را اس خطہ کی نشاندہی کی جائے جہاں مسلماں امت بستی ہے۔ خدارا سوچیے بقول اقبال ؎

فرقہ پرستی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

مسلم امت کی موجودہ افراتفری، آپادھاپی اور دھینگا مشتی کے دور میں ہمارا علماء کرام سے بلکہ ہر اس شخص سے جو اسلام کو اپنا دین، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا رہبر و رہنما، قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام سمجھتا ہے اور اس پر دل سے ایمان بھی لایا ہے ہمارا سوال یہ ہے کہ:

۱۔ کیا اس وقت اصل ضرورت اپنے فرقے اور گروہ کی بالادستی قائم کرنے کی ہے یا دین اسلام کے غلبہ کی ہے، جو ہم سب کا دین ہے؟

۲۔ کیا مذہبی فرقہ واریت اور دوسرے تعصّبات میں الجھ کر آپ کا ضمیر واقعی مطمئن رہتا ہے یا یوں ہی

وقت گزاری اور ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے کی عادت کا حصہ ہے؟

۳۔ کیا تاریخ کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت شدہ نہیں ہے کہ اس فرقہ واریت اور دوسرے تعصّبات نے ہر موڑ پر اسلام اور ملت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور امت کی وحدت پارہ پارہ ہوئی ہے او رمسلمان مغلوب ہوئے ہیں؟

۴۔ کیا موجودہ عالمی پیچیدہ مسائل کے ہجوم میں کسی بھی فرقہ وارانہ اور دیگر تعصّبات کی گنجائش موجود ہے؟

۵۔ کیا مسلمانوں کے گروہی اختلافات اور تعصّبات ناموس ملت کی رسوائی اور عالمی سطح پر ان کی جگ ہنسائی کا سامان نہیں کرتے؟

۶۔ کیا موجودہ فرقہ واریت سے پہلے امت مسلمہ کی عزت وعظمت ناکافی اور نامکمل تھی، کہ دین میں فرقے قائم کرنا ضروری ہو گئے ہیں؟

۷۔ عالمی کفر جو اسلام اور مسلمانوں دونوں کا دشمن ہے، وہ ہمیں مسلمان کے طور پر جانتا ہے اور اسی حیثیت میں ہمارے ساتھ معاملہ کرتا ہے یا ہمیں فرقوں اور قومیتوں کے حوالے سے جانتا ہے؟

۸۔ کیا قرآن مجید یا حدیث نبوی سے کوئی ایسا ثبوت یا اخلاقی جواز ملتا ہے کہ موجودہ فرقہ واریت اور تعصّبات کو جائز اور امت محمدیہ کے لیے مفید قرار دیا جائے؟

۹۔ مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر ہم سے اسلام، ایمان کے حوالہ سے سوال کریں گے یا فرقہ اور مسلک کے بارے میں پوچھیں گے؟

۱۰۔ کیا موجودہ دور میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ ہم فرقہ فرقہ ہو کر کر سکتے ہیں یا ملت واحدہ بن کر اپنا دفاع کر سکتے ہیں؟ کس حیثیت میں اسلام کو غالب کر سکتے ہیں؟

۱۱۔ کیا اب بھی ہم سقوط بغداد، سقوط غرناطہ، سقوط بیت المقدس، سقوط عراق و افغانستان اور سقوط ڈھاکہ جیسے دیگر حوادث کے منتظر ہیں جو ہمارے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑیں؟

۱۲۔ کیا پاکستان میں شریعت نافذ نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب علماء کرام اور دینی سیاسی جماعتوں کی باہمی نااتفاقی نہیں ہے؟

اگر ان سوالات سے ہمارے ضمیر چبھن محسوس کرتے ہیں اور ہمارے ذہن مضطرب ہوتے ہیں تو آیئے بقیہ عالم اسلام خصوصاً پاکستان وایران کو بچانے کے لیے فرقوں کے کچے گھروندوں کو گرا کر اسلام کی

مضبوط فصیل میں پناہ لے لیں۔ تعصّبات کے گھونسلے توڑ کر دین کا ناقابل شکست قلعہ تعمیر کریں۔ علاقائی ولسانی حد بندیوں کو دین کے سمندر میں جذب کر دیں، نیلے پیلے، رنگ چھوڑ کر خود پر صبغة اللہ (اللہ کا رنگ) چڑھائیں۔ امت مسلمہ اور عالم اسلام کے اردگرد اٹھنے والے طوفانوں کو محسوس کریں اور کشتی ملت کو ساحل تک بحفاظت لے جانے کی فکر کریں۔

تبصرہ کتب　　　مدیر

سیکس ایجوکیشن

از پروفیسر ارشد جاوید

بدقسمتی سے ہمارے رویے عموماً افراط وتفریط پر مبنی اور اعتدال سے محروم ہوتے ہیں۔ جنس کو لیجیے یہ ہر انسان کا مسئلہ ہے اور مرد وعورت کو اس سلسلے میں صحیح معلومات اور ضروری رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مغرب ایک انتہا پر چلا گیا کہ اس نے جنسی تعلیم کو فحاشی اور عریانی تک پہنچا دیا اور مشرق (اور مسلم معاشرے نے) اس پر مہذب انداز میں گفتگو یا تحریری رہنمائی کو بھی شجر ممنوعہ بنا دیا حالانکہ یہ ہر فرد کی جائز اور شرعی ضرورت ہے۔ حالت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس موضوع پر گفتگو کرتے نہیں شرماتے لیکن ہمارا شرم وحیاء کا معیار اتنا اونچا ہے کہ اس موضوع پر کچھ کہنا یا لکھنا گویا حرام ہے۔ صحیح رہنمائی میسر نہ آنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لوگ غلط او غیر مصدقہ باتوں پر یقین کر کے نقصان اٹھاتے ہیں

۔

پروفیسر ارشد جاوید صاحب ماہر نفسیات ہیں اور انہوں نے لوگوں کی جائز احتیاج کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی تحریر میں ہرگز کوئی فحش اور قابل اعتراض بات نہیں اور والدین اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اس کتاب سے ضروری رہنمائی لے سکتے ہیں۔ معروف ادیب اور صوفی دانشور اشفاق احمد مرحوم نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک بہت ہی مفید

،توجہ طلب اور خیال انگیز کتاب ہے اور اس کا ہر گھر میں ہونا اس لیے ضروری ہے کہ بچہ جونہی عنفوان شباب کو پہنچے اس کا مطلوبہ مواد پہلے ہی سے گھر پر موجود ہو،جس طرح ہمارے گھروں میں بلوغت کو پہنچنے والی لڑکیوں کے لیے بڑی بوڑھیاں پہلے سے گھروں میں موجود ہوتی ہیں اور لڑکی میں بدلتی ہوئی تبدیلیوں کو بڑے سلیقے سے لڑکی کو سمجھا دیتی ہیں ضرورت اس امر کی تھی کہ لڑکوں کو بھی سیکس کی ابتدائی تعلیم فراہم کی جائے اور ان کی صدیوں کی غلط فہمیاں دور کی جائیں۔ہم والدین پروفیسر ارشد کے بطور خاص شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس اہم کام کا بیڑہ اٹھایا''

۲۰۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے اور یہ علم وعرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ،اردو بازار،لاہور سے دستیاب ہے۔کتاب انٹرنیٹ www.noorclinc.com پر بھی دستیاب ہے۔ مصنف سے ان کے کلینک بائیوسٹیٹ لیب (بالمقابل فاطمہ میموریل ہسپتال)۱۸۱ شادمان لاہور یا فون ۹۴۸۴۶۵۵-۰۳۰۰ پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

قارئین کے خطوط

کس قیامت کے یہ نامے۔۔۔

☆جناب مدیر البرہان بھولے بادشاہ ہیں جو علماء کی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں گزارشات پیش کرتے رہتے ہیں۔جناب!یہ وہ لوگ ہیں جن کی بنیاد ہی فرقہ واریت پر ہے۔ان میں جو سیاستدان ہیں وہ سیکولر سیاستدانوں سے بھی برے انسان ہیں اور ان میں وہ سارے عیب موجود ہیں جو دوسرے سیاستدانوں میں پائے جاتے ہیں۔ملک میں نفاذ شریعت نہ ہونے کے یہ دوسروں سے بڑھ کر ذمہ دار ہیں۔مدرسوں کے علماء کو پتہ ہی نہیں کہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا اور یہ ابھی تک تیسری صدی ہجری کا مرتب کردہ نصاب پڑھا کر 'خدمت دین' سے خوش ہیں۔آپ کبھی ان کی اصلاح نہیں کر سکتے،یہ صرف اس قابل ہیں کہ زمانہ ان کو مٹا کر روندتا ہو گزر جائے بلکہ گزر رہا ہے لیکن ان کو اس کا احساس ہی نہیں۔

(رحیم الدین،ڈسکہ)

☆ آپ کے جریدے میں فکری ونظری مباحث کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بہت سے عملی کام جو ہمارے دائرہ اختیار میں آج ہیں ان سے صرف نظر ہو جاتا ہے۔مغربی سائنس و

inner back Title

ٹیکنالوجی کے حوالے سے البرہان میں بحث بہت طول پکڑ چکی ہے اسے اب ختم ہوجانا چاہیے۔ دینی مدارس کے نصاب و نظام کے حوالے سے بحث بہت عمدہ ہے لیکن اس میں دینی مدارس کے علماء کا نقطہ نظر ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

(مولانا محمد اصغر، استاد جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد)

☆ آپ نے خواہ مخواہ اسلام اور سائنس کے حوالے سے البرہان میں بحث چھیڑ رکھی ہے حالانکہ اس سے کہیں اہم سوشل سائنسز ہیں کیونکہ یہ انسان کی فکری ساخت پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اسلام اور سوشل سائنز پر لکھیں اور ماہرین سے لکھوائیں۔

(پروفیسر انجم زاہد، گوجرانوالہ)